جدلیاتی
اور
تاریخی
میٹیریلزم

شاہ محمد مری

جملہ حقوق بحقِ سنگت اکیڈمی محفوظ ہیں

نام کتاب ..... جدلیاتی اور تاریخی میٹیریلزم
مصنف ..... شاہ محمد مری
اشاعت 2023ء
قیمت 500روپے
پبلشر ..... سنگت اکیڈمی

ملنے کا پتہ:
سنگت اکیڈمی
مری لیب، ڈاکٹر شیر محمد روڈ، کوئٹہ
www.sangatacademy.net
فون نمبر:0300-3829300

سنگت اکیڈمی آف سائنسز

اور

بلوچستان سنڈے پارٹی

کے نام

زندگی کیا ہے؟ عناصر کا ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ انہی اجزا کا پریشاں ہونا

نرائن چکبست

فہرست

ڈائلیک ٹکل میٹیریلزم 8

تضاد کا قانون 16

تضاد کی قسمیں 21

مخاصمانہ اور غیر مخاصمانہ تضادات 21

بنیادی اور غیر بنیادی تضادات 21

اندرونی اور بیرونی تضادات 21

کوالٹی اور کوانٹیٹی 28

کوالٹی 29

کوانٹیٹی 30

نفی کی نفی کا قانون 35

فارم اور کانٹینٹ 37

قوم اور قومی سوال 42

ریاست 47

علم اور عمل کا نظریہ 53

حواسِ خمسہ 55

مغز یا برین 57

بیرونی دنیا 60

عمل 60

بنیاد اور بالائی ڈھانچہ 66

اخلاقیات 73

سائنس 73

آرٹ 73

نظریہ 74

ہسٹاریکل میٹیریلزم 75

تاریخ میں فرد کا رول 76

قدیم کمیونزم 79

غلام داری سماج 80

فیوڈلزم 81

کیپٹل ازم 83

کماڈٹی 88

پیسہ آتا کہاں سے ہے؟ 90

اشتہار 95

اتنا پیسہ کرنا کیا ہے؟ 97

کیپٹلزم کی تباہیاں، تباہ کاریاں 99

معاشی بحران 99

مالیاتی بحران	101
ایٹمی جنگ کا خطرہ	102
بیگانگی	103
اخلاقی بحران	110
عصمت فروشی	111
کلاسز اور کلاس سٹرگل	112
بنیادی طبقات	112
غیر بنیادی طبقات	114
پرولتاریہ کی بغاوت.....	115
کلاس اسٹرگل کی صورتیں	117
سیاسی پارٹی	120
پارٹی اخبار	126
پارٹی کے خلاف سازشیں	127
کپٹلزم کا متبادل نظام	141

ڈائلیک ٹکل میٹیریلزم

کائنات' انسان کے لیے ایک راز رہی ہے۔ اِسے جاننے کے لیے انسان نے جو ذریعہ اپنایا وہ حسی تجربے یا مشاہدے کا تھا۔ یہ زبردست طریقہ تھا۔ یہی طریقہ آگے چل کر سائنس کہلایا۔

انسان میں دو عظیم صلاحیتیں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک سائنس ہے دوسری آرٹ۔ سائنس دیگر باتوں کے علاوہ طبعی کائنات کی گہرائیوں کا انکشاف کرتی ہے۔ آرٹ فطرت اور معاشرے میں انسان کی زندگی کے عمومی اصولوں پر روشنی ڈالتا ہے۔

سائنس وہ دریافت کردہ حتمی سچائی ہے جس کی تشریح کی جاسکتی ہو اور جو ہر جگہ تجربے سے یکساں نتیجہ دے سکے۔ سائنس میں فلسفہ کے ہائپوتھیسز یا تھیوری پر تحقیق کرنے کی صلاحیت تو موجود ہے مگر اسے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی اُس وقت تک صلاحیت موجود نہیں ہے جب تک کہ یہ ''ایسے'' یا ''ویسے'' ثابت نہ ہو جائے۔ لہٰذا ''ثابت شدہ سچائی کو سائنس کہا جاتا ہے۔''

سائنس حقائق کی تلاش میں کبھی اپنے آپ کی بھی نفی کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے اور کہیں اپنی پچھلی بات کی تصدیق کرتے ہوئے آگے چلتی جاتی ہے۔ سائنس ہمہ وقت نئے حقائق کھوجتی جاتی ہے اور نئے ادراک کے اعلانات کرتی جاتی ہے۔

سائنس کا کام اپنے دریافت کردہ حقائق کی درجہ بندی کرنا بھی ہے، اُن کی اہمیت کو تسلیم کرانا بھی ہے۔

سائنس مروجہ عقیدوں، روایتوں، پیش گوئیوں، خوابوں اور بشارتوں پر تحقیق تو خوب کرتی ہے اور انھیں حق یا باطل بھی قرار دیتی ہے مگر خود کو اُن کی مطابقت میں ڈھالنے کی کوشش کبھی نہیں کرتی۔ اس کے برعکس یہ عقیدے، روایتیں، پیش گوئیاں، خواب اور بشارتیں ہیں جو اپنی توضیح و تشریح کے لیے سائنس کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ دنیا بھر کی روایات ہر وقت اِس جستجو میں رہتی ہیں کہ ''دیکھا؟ سائنسی فلاں حالیہ دریافت نے ہماری صدیوں پرانی فلاں روایت کو برحق ثابت کر دیا ہے۔'' سائنس ایسا نہیں کرتی۔

دانائی، حکمت اور جاننے پہ عاشق ہونے کے عمل کو ''فلسفہ'' کہتے ہیں۔ یہ وجود اور زندگانی کے قوانین کی سائنس کا علم ہے اور یہی تمام علوم کی ماسٹر یونی ورسٹی ہے۔

آج کی ترقی یافتہ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے کی الگ سائنس اور الگ سپیشلٹی ہوتی ہے۔ ہماری ڈاکٹری کے متعلق تو مزاح بھرا فقرہ موجود ہے کہ ایک وقت آئے گا جب دائیں آنکھ کا سپیشلسٹ الگ ہوگا اور بائیں کا الگ۔ دائیں گھٹنے کا ماہر الگ ہوگا اور بائیں کا الگ۔ اِن ساری سپیشلٹیوں کے بنیادی عمومی قوانین میں ہم آہنگی پیدا کرنے والے علم کو ''فلسفہ'' کہتے ہیں۔ فلسفہ سارے علوم (سائنسز) کے قوانین کے ہار کو اکٹھا رکھنے والا دھاگا ہے۔

بلاشبہ، سیاست بھی بے شمار سائنسوں کو ملا کر چلتی ہے۔ مگر فلسفہ سیاست سے بھی زیادہ علوم کا مجموعہ ہوتا ہے۔ موٹی موٹی بات کی جائے تو سیاست' فلسفہ کے بغیر دُم بھی نہیں ہلا سکتی ہے۔ اِن دونوں کو جدا نہیں کیا جا سکتا بل کہ فلسفہ کو کسی بھی علم و سائنس سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ چلیں ہم فقرے کو یوں پیش کرتے ہیں: سائنس فلسفہ نہیں ہوتی مگر فلسفہ سائنس ہوتا ہے۔

مَیٹر (Matter) کو سمجھا جا سکتا ہے۔ میٹر، میٹر کی حرکت اور پراسیس تینوں قابلِ مشاہدہ ہیں۔ مَیٹر ابھی جتنا سمجھا گیا ہے، اُس سے کئی گنا اب تک ہماری لاعلمی میں پڑا ہے۔

یہ حتمی بات ہے کہ پوری کائنات کچھ بنیادی سائنسی قوانین پر چل رہی ہے۔ یہ قوانین سائنسز کی ماں یعنی فزکس، فزکس کی بہن یعنی میتھ میٹکس اور کیمسٹری کے ہیں اور یہ قوانین عالم گیر ہوتے ہیں۔ ان قوانین کا ایشیا، افریقا الغرض پوری دنیا پہ اطلاق ہوتا ہے۔

اسی طرح یہ قوانین کسی ایک زبان، علاقے کے نہیں ہوتے، کسی ایک نسل کے بھی نہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ یہ ہندو فزکس ہے، یہ یہودی فزکس ہے۔ نہ ہی دو کا پہاڑا مکران میں الگ ہوتا ہے اور موزمبیق کے لیے الگ۔ اسی طرح دولت ذاتی ہوسکتی ہے، اعتقاد ذاتی ہوسکتا ہے، پسند ناپسند ذاتی ہوسکتی ہے مگر دنیا بھر میں ایسا نہیں ہوسکتا کہ سائنس کسی کی ذاتی ملکیت ہو۔

المختصر کائنات پہ لاگو قوانین صرف زمین اور مریخ کے بھی نہیں ہوتے۔ یہ سارے سیاروں پہ یکساں لاگو ہوتے ہیں۔ کُل کائنات کے قوانین۔

کائنات کے قوانین دریافت کیے جا سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں جس کا علم حاصل نہ کیا جا سکے، جس کی تشریح نہ کی جا سکے۔ اب تو سائنس اس قدر طاقت ور ہوگئی کہ سب کو یہ بات منوا گئی۔ مگر ماضی میں ایک بڑا کشمکش بھرا اور متشدد طویل زمانہ گزرا جب انسان اس بات پہ ایک دوسرے کا سر توڑتا رہا ہے۔

قانون ہے کہ ہر میٹیریل چیز دوسرے سے جڑی ہوئی بھی ہوتی ہے اور ایک دوسرے پر منحصر بھی۔ کوئی مظہر ''ابدی'' نہیں ہوتا، حتمی نہیں ہوتا۔ ابدی، حتمی اور ثبات والی چیز تو ''ہمہ وقت تبدیلی'' ہے، بس۔

آپ کسی مَیٹیریل چیز کو اُس کے آس پاس سے کاٹ کر دیکھ ہی نہیں سکتے، جان ہی نہیں سکتے۔ یعنی کائنات دراصل اشیا، مظاہر اور پراسیسوں کا ایک مربوط مجموعہ ہے۔ اس کے اندر موجودات ایک دوسرے سے متعلق اور منسلک ہیں۔ ایک دوسرے پر اثر بھی ڈالتے ہیں، ایک دوسرے سے متاثر بھی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی حد بندی بھی کرتے ہیں۔ اس لیے نیچر میں موجود کسی بھی چیز کی ذاتی حیثیت بھی اہم ہوتی ہے مگر اُسے اس کے ماحول، اُس کے آس پاس سے کاٹ کر نہ دیکھا جا سکتا ہے، نہ سمجھا جا سکتا ہے۔

فلسفے کی دنیا میں ہمیشہ سے ایک ایسا بنیادی اور عالم گیر سوال موجود رہا ہے جس پہ انسان صدیوں سے غور و فکر، بحث مباحثے، نوک جھونک، جھگڑے پھڈے کرتا رہا ہے۔ حتیٰ کہ ایک آدھ قتل سے لے کر لاکھوں کروڑوں انسانوں کے قتل ہوجانے تک کے مناقشے رہے ہیں۔ اسے فلسفے کا

''بنیادی سوال'' کہتے ہیں۔

لوگ اکثر کہتے ہیں اور ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ دنیا میٹیریل دنیا ہے۔ بالکل یہاں موجود ہر چیز مَیٹر ہے اور مَیٹیریل چیز سے نکلی ہوئی ہر چیز میٹیریل ہے۔ لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ اس میٹیریل دنیا کا بنیادی عنصر یعنی میٹر (Matter) کب پیدا ہوا؟ اس کے پیدا ہونے سے پہلے کیا کچھ تھا؟ پھر یہ بھی کہ کیا مَیٹر کو فنا ہے؟ اور اگر ہے تو اس کے فنا ہونے کے بعد کیا ہوگا؟

بوڑھا فلسفہ ہزاروں برس تک اس گتھی کو سلجھانے میں مغز کھپاتا رہا۔ یہ مٹی کا ایسا گھوڑا تھا کہ پاکستانی انقلاب کی طرح پاؤں پر کھڑا کرو بھی گر جاتا ہے، سر کے بل کھڑا کرنا چاہو تو بھی گر جائے۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

تب فلسفے کا فزکس نامی ہونہار بیٹا' باپ کی مدد کو آیا۔ فزکس نے ثابت کر دیا کہ میٹر وہ ہے جو جگہ گھیرتا ہو، جس کا وزن ہو اور جو پانچوں حسوں میں سے کسی ایک کے ذریعے محسوس کیا جا سکتا ہو۔ یعنی مَیٹر ہمارے حواس سے آزاد اپنا وجود رکھتا ہے۔

اِدھر تک تو خیر تھی۔ ستے خیراں والی بات فزکس کی یہ ہے کہ اس نے یہ ثابت کیا کہ مَیٹر ازلی بھی ہے ابدی بھی۔ یہ مستقل طور پر موجود رہا ہے۔ لہٰذا اس کا ڈیٹ آف برتھ موجود ہی نہیں ہے۔ یعنی میٹر کے بارے میں ''اولین بات''، ''اولین واقعہ''، ''شروعات'' والے لفظ و تصورات موجود ہی نہیں ہیں۔

اسی طرح فزکس نے یہ بھی ثابت کیا کہ مَیٹر کی کوئی ایکسپائری ڈیٹ بھی نہیں ہوتی۔ یعنی میٹر کے لیے فنا کا لفظ اور تصور موجود نہیں ہے۔ اب جب بھی بلوچ کہتا ہے کہ دنیا فانی ہے یا دنیا چار دن کا کھیل ہے تو وہ اصل میں دنیا یا مَیٹر کی بات نہیں کر رہا ہوتا ہے، وہ تو اپنی زندگی کے بارے میں بول رہا ہوتا ہے۔ ''افسوس ہم نہ ہوں گے'' والا معاملہ ہے ورنہ یہ زندگی کے میلے دنیا میں کبھی کم نہ ہوں گے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ میٹر اور اُس سے بنی کائنات کسی روح کا سایہ نہیں ہے۔ اگر ''سایہ'' کی تشبیہ کو قائم ہی رکھا جائے تو بہ قول فہمیدہ ریاض، دراصل یہ حقیر و فقیر میٹر ہی ہے جس کا

سایہ خیال، تصور، روح وغیرہ ہیں۔ یہ اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔

میٹر ختم نہیں ہو سکتا، بس یہ اپنی شکل بدلتا رہتا ہے، اس کے اجزا اِدھر اُدھر منتشر ہو جاتے ہیں، اپنے اجزا میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور پھر کہیں مرتب ہوتے ہیں۔

ہم مٹی ہیں، مر کر ہم مٹی، یعنی قبر کی مٹی سے مل جائیں گے اور انجام یہ کہ بالآخر مٹی۔ مگر ہم سے مل کر یہ مٹی پھر درخت پودا وغیرہ بنے گی جسے پھر مر کر مٹی بننا ہے۔ شکلیں بدلتے رہنا۔ کوئٹہ کے سریاب روڈ پہ واقع جی ایس پی (جیالوجیکل سروے آف پاکستان) کے میوزیم میں ایک ہال کے اندر بڑے بڑے پتھر ترتیب سے فرش پر رکھے ہوئے ہیں۔ مگر گائیڈ کو جب اندازہ ہو کہ آپ انھیں معمولی پتھر سمجھ رہے ہیں تو وہ فوراً کہہ اٹھے گا، ''صاحب یہ ڈیرہ بگٹی کے علاقے میں تین کروڑ سال قبل کے 20 میٹرک ٹن وزن والے بڑے جانور 'بلوچی تھیریم' کی ہڈیاں ہیں جو پتھر یا فوسلز میں تبدیل ہو چکی ہیں۔''.....ارے؟ اس کا کیا مطلب ہے؟ جسم پتھر میں بدل گیا؟.....اچھا اچھا، یعنی میٹر اپنی شکلیں سالڈ (ٹھوس)، لیکوئڈ (مائع)، پلازما اور گیس کی صورتوں میں بدلتا رہتا ہے۔

اُنیسویں صدی کی ایک دوسری دریافت ''توانائی کا ایک دوسرے میں بدلنے'' کا انکشاف ہے، جو 1847ئ میں رابرٹ میئر نے کیا۔ پرانے زمانے میں خیال تھا کہ آواز، حرارت اور روشنی مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ مگر اُنیسویں صدی کی رابرٹ میئر کی اِس دریافت سے پتہ چلا کہ یہ سارے مظاہر مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں، بل کہ ایک دوسرے میں بدل بھی سکتے ہیں۔

اندازہ ہوا کہ بلوچی تھیریم مر کر فنا نہیں ہوتا بل کہ اُس کے اندر موجود کیمیائی عناصر دوسری صورتیں اختیار کرتے ہوئے اس دنیا میں موجود رہتے ہیں۔ عناصر کا مسلسل ظہور و ترتیب اور عناصر کا ہمہ وقت پریشان رہنا۔ میٹر اپنے عناصر کے اسی ترتیب و پریشانی کے اَمر سلسلے میں رہتا ہے۔ اسے کوئی فنا نہیں ہے:

بگڑے گی اور بنے گی، دنیا یہیں رہے گی

سائنس ڈنڈے ماری کی اُلٹ چیز ہے۔ اس میں سندھی زبان کے فقرے ''رکھ مرشدءَ

تے'' کا اطلاق نہیں ہوتا۔ سائنس اِس بات کو بھی نہیں مانتی کہ کائنات یا اُس کے مظاہر جامد و ساکت حالت میں رہتے ہیں۔ سائنس صرف حرکت کو مانتی ہے، تغیر پذیری کو مانتی ہے اور سائنس اشیا کا مطالعہ بھی اُن کی حرکت میں ہی کرتی ہے.....'' میٹر اِن موشن''۔ یہ حرکت دائمی ہے، کبھی نہیں رکتی اور اگر کہیں سکون نظر آ بھی جائے تو جان جایئے کہ یہ اوپر کا سکون ہے، سطح کا سکون۔

حرکت ہی کے سبب تبدیلی، تجدید اور ترقی ممکن ہے۔ نیچر میں کبھی سکوت، جمود اور ٹھہراؤ نہیں ہوتا۔ یہ مسلسل حرکت اور تبدیلی کے اسی عمل میں پرانا تباہ ہوتا جاتا ہے اور کچھ نہ کچھ نیا پیدا ہوتا جاتا ہے۔ یہ مسلسل ابدی تبدیلی کا عمل ہے۔ گل خان نصیر کے بہ قول ''ہستی میں تغیر لازم ہے.....''۔ حرکت ہی کے طفیل چیزیں پیدا ہوتی ہیں، بڑھتی ہیں، گھٹتی ہیں اور فنا ہوتی ہیں۔

مطلب یہ کہ کائنات صرف حرکت میں وجود رکھتی ہے۔ میٹر متحرک رہتا ہے۔ ثبات اک تغیر کو ہے، بس۔ دوسرے لفظوں میں مَیٹر اور حرکت لازم و ملزوم ہیں۔

اور یہ تو ظاہر ہے کہ حرکت کے لیے جگہ یعنی سپیس ضروری ہوتی ہے اور وہ ٹائم کے اندر ہوتی ہے۔

سائنس میٹر کو نہ صرف ایٹم تک جان چکی ہے بل کہ وہاں سے بھی آگے پروٹان اور بے آرام و متحرک الیکٹرون تک اس نے دریافت کر لیے ہیں۔

چناں چہ سماج میں کوئی کام، جی ہاں انقلاب سمیت کوئی کام اچانک، اتفاقیہ یا حادثاتاً نہیں ہوتا۔ ہر بات کے پیچھے سبب موجود ہوتے ہیں۔ کبھی ظاہر اور کبھی پوشیدہ۔ ایسے ''سبب'' جو میٹیریل ہوں اور جن کی تشریح ہو سکتی ہو۔

اسی طرح سائنس میں کوئی ''اچانک'' کود جانے والا فلمی ہیرو نہیں ہوتا کہ وہ آ جائے اور ساری مشکل حل کر دے۔ سائنس ہیرو کو نہیں مانتی، ہیرو گیری کو نہیں مانتی اور ہیرو پرستی کو نہیں مانتی۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سائنس نتائج نہیں، طریقہ ء کار دیکھتی ہے، (میتھڈالوجی، ناٹ رزلٹ)۔

ہم انسانوں کی طرح، ساری نیچر بھی تباہ ہوتی ہوئی چیز کا ساتھ نہیں دیتی بل کہ اُس چیز کو

اہمیت دیتی ہے جو پیدا ہو رہی ہے۔

میٹر احساسات سے عاری ہوتا ہے۔ اُس کے کوئی عزیز رشتے دار، گرائیں، ہم وطن اور ہم قوم نہیں ہوتے۔ وہ خوشی، غم، خوف، طمع، تعریف اور تنقید سے مبرا ہے۔ نہ اُس کا کوئی دوست ہے نہ دشمن۔ اُسے نہ درد ہوتا ہے نہ پروا۔ نہ وہ کسی چیز پہ رحم کھاتا ہے، نہ کسی کو مقدس و سپریم مانتا ہے۔

میٹر کسی اجازت اور خوشنودی کو نہیں جانتا۔ یہ کسی کی خواہشات کی پروا نہیں کرتا۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ کوئی اُس کے قوانین کو پسند یا ناپسند کرتا ہے۔ آپ خواہ چوں و چرا کریں یا نہ کریں، مسکرائیں یا غصے سے لال پیلے ہوں مگر اُس کے قوانین کو تسلیم کرنا ہوگا۔ نہ صرف قوانین کو بل کہ اُن سے برآمد شدہ نتائج کو بھی۔

چناں چہ آزادی، فطرت اور سماجی قوانین سے آزاد ہونا نہیں ہے بل کہ آزادی یہ ہے کہ آپ اِن قوانین کے علم سے کتنی زیادہ واقفیت رکھتے ہیں اور اُن کی مطابقت میں عمل کرنے کی کتنی اہلیت رکھتے ہیں۔ ایک ایسی اہلیت جو بالکل اُسی علم سے ابھرے جو کچھ فطری قوانین پر لاگو ہوتا ہے وہی سماجی ارتقا کے قوانین پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ انسان اُس وقت آزاد ہوتا ہے جب وہ انھیں جان لے اور انھیں ایک منصوبہ بند، سائنسی انداز میں استعمال کر سکے۔ وہ نیچر اور سماج کے قوانین سے دور ہو کر آزاد نہیں ہو سکتا۔

کائنات کو جاننے کے لیے سائنس آپ کو دو ضروری باتیں بتاتی ہے:

1۔ آپ کی بنیادیں میٹیریل ہوں۔ جاننے کے اِس طریقے کو ''میٹیریلزم'' کہتے ہیں۔ یہ ''اِزم'' گریک زبان سے قرض لی گئی وہ دُم ہے جو کسی تھیوری، ڈاکٹرائن یا کاز والے لفظ کے پیچھے لگائی جاتی ہے۔ مثلاً کیپٹلزم، بدھ ازم، سیکسزم، کیوب ازم اور ریس ازم وغیرہ۔ میٹیریلزم کا مطلب ہوا میٹیریل دنیا سے متعلق۔ وہ چیزیں جنھیں واضح طور پر ثابت کیا جا سکے کہ وہ میٹر میں وجود رکھتے ہیں۔

2۔ کائناتی قوانین کا علم ''کیا، کیوں، کیسے اور کب'' جیسے سوالات کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ بحث مباحثے کے بغیر علم نہیں ملتا۔ سوال جواب کے مباحثے کے ذریعے حقائق تک پہنچنے کے

طریقے کو جدلیات یا ''ڈائلیک ٹکس'' کہتے ہیں۔ڈائلیک ٹکس نیچر، انسانی سماج ،فکر کی حرکت اور ترقی کے عمومی اصولوں کی سائنس ہے۔

مندرجہ بالا دونوں لوازمات کو ملا کر اس سائنس کو جدلیاتی میٹیریلزم یا ''ڈائلیک ٹکل میٹیریلزم'' کہیں گے۔

یعنی فطرت کے مظاہر کو سمجھنے کے لیے ڈائلیک ٹکل طریقہ اختیار کیا جائے اور اِن مظاہر کی تعبیر یا تصور میٹیریل ہو۔

مباحثہ کا ایسا طریقہء کار جس میں موضوع کے حق میں اور اس کے خلاف پیش کیے گئے دلائل میں موجود تضاد کی نشان دہی کی جاتی ہے اور اس کی روشنی میں کسی نتیجے پر پہنچا جاتا ہے۔اس سے ایک اور بات بھی نکلتی ہے۔خیال صرف لفظ کے میٹیریل پیکر میں ہی وجود رکھتا ہے۔انسان خود سوچے یا اپنے خیالات کا بلند آواز سے اظہار کرے یا انھیں تحریر میں لائے ،خیال ہمیشہ الفاظ کے پیکر میں ہی ہوتا ہے۔ایسا نہ ہوتا تو گویائی اور تحریری زبان کے بغیر نسل ہانسل کا بیش قیمت تجربہ رائیگاں چلا جاتا اور ہر نسل مجبور ہوتی کہ دنیا کے مطالعے کے مشکل سلسلہ عمل کو نئے سرے سے شروع کرے۔

تضاد کا قانون

فزکس کی دریافتوں کا ایک اہم ستون یہ ہے کہ ایٹم کو تباہ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ایٹم لازوال ہے۔البتہ ایٹم سمیت مَیٹر کی ساری قسمیں تبدیلی کے لیے بے قرار، راغب اور بے چین رہتی ہیں۔

اشیا حرکتی دنیا میں ایک سپیس یا جگہ میں وجود رکھتی ہیں۔ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے ،ایک دوسرے کی جگہ لیتے ہوئے۔اسی طرح ہر شئے ایک خاص حالت میں ایک ٹائم کی حامل ہوتی ہے۔ چیز (میٹر نہیں) کا ایک آغاز ہوتا ہے اور ایک انجام اور آغاز و انجام کے درمیانی وقفے میں وہ مختلف مراحل اور حالتوں سے گزرتی ہے۔یعنی اشیا ٹائم سے جڑے ہوئے ایک سپیس وجگہ میں ہی حرکت کرتی ہیں۔

ہر چیز کے اندر اُس کا الٹ بھی موجود ہوتا ہے اور اس طرح کی جذب شدہ صورت میں موجود ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہر ایک سالم چیز کے اندر متضادوں کی موجودگی ہوتی ہے۔ چناں چہ دنیا میں کوئی چیز یا مظہر ایسا نہیں جسے اضداد میں تقسیم نہ کیا جا سکے۔ان مخالف و متضاد قوتوں کے درمیان باہمی سٹرگل اور جنگ لازمی رہتی ہے۔یعنی اضداد اُسی چیز یا مظہر میں رہتے ہوئے باہم دست و گریباں رہتے ہیں۔اس ہاتھا پائی کے بغیر اُس چیز یا مظہر میں کوئی نشو ونما اور حرکت ممکن ہی نہیں ہوتی۔مطلب یہ ہے کہ چیز کی شکل وصورت کے اندر موجود تضادات میں جنگ جاری رہتی ہے۔امن حرام ہے، سکون وسکوت ناممکن ہے۔ ہر چیز میں ایک متحرک و

سرگرم جنگ جاری وساری رہتی ہے۔ان کے بیچ مفاہمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ان کی علیحدگی اورمخالفت صرف باہمی تعلق اوراتحاد کے باعث وجود رکھتی ہے۔ان کا اتحادصرف اُن کی علیحدگی میں وجودرکھتا ہےاوران کا باہمی تعلق آپس کی مخالفت میں۔دونوں قطبین کے باہمی جذب یا قطعی علیحدگی کا ناممکن ہوتا ہے۔

سماج کے اندر دو متضاد قوتیں موجود ہیں: جائیداد والا اور بے جائیداد۔ جائیداد والا بھاری ہےمگر بہ ظاہر،کم زور بے جائیداد طبقہ اُس کے ساتھ ٹکراؤ کو کبھی ترک نہیں کرتا۔

متضادوں کا یہی ٹکراؤ ترقی اورتبدیلی کا ضامن ہوتا ہےاوراسی تضاد کے ٹکراؤ سے کوانٹیٹی اورکوالٹی والی تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

تضاد کا قانون دنیا کے اصل کو سمجھنے کی کنجی ہے۔اسی طریقے کو ساری چیزوں کی نشوونما کے مطالعے پہ استعمال کرنا لازم ہے۔اس طریقے کو سیکھ کر ہی ممالک کی تاریخ،حال اور مستقبل کے بارے میں درست تجزیہ کیا جاسکے گا۔

عمومی طور پر داخلی تضادات ہی سے درخت یا جانور بڑے ہوتے جاتے ہیں۔اسی طرح سماجی ترقی بھی خصوصی طور پر اندرونی تضادات ہی کے ذریعے ہوتی ہے۔روس بادشاہت سے سوشلزم میں داخل ہوا تو وہاں بیرونی اثرات بہت کم تھے،مثلاً آس پاس کوئی بڑی جغرافیائی تبدیلی، کوئی بڑی ماحولیات تبدیلی نہ آئی تھی۔نہ کوئی دوسری بہت بڑی بیرونی تبدیلی نے روس کے اندرونی حالات کا رخ موڑ دیا۔داخلی تضادات نے ہی یہ کام کیا،کلاس تضادات نے۔ہاں،اس پراسیس کو پہلی عالمی جنگ نے ضرور سبک رفتاری عطا کی تھی۔

انڈے کے اندر تضادات موجود ہوتے ہیں تو ایک خاص ٹمپریچر اورنمی دینے سے چوزہ پیدا ہوتا ہے۔مگر کسی پتھر کو جتنا چاہے باہر سے ٹمپریچر اورنمی دے دو، چوزہ پیدا نہیں کر سکے گا۔

اب یہ نہ سمجھا جائے کہ تضادات کے سبب پیدا شدہ حرکت اور تبدیلی دریائے سندھ کی ڈولفن مچھلی کی طرح اندھی ہوتی ہے۔نہیں۔اس کی سمت ہوتی ہے۔یک طرفہ سمت: جدید کی طرف۔یہ قدیم سے جدید کی طرف تبدیل ہونے کو مچلتی ہےاور یہ ایسے تبدیل نہیں ہوتی کہ پاکستانی

فیوڈل حکم رانی کی طرح ایک دونمائشی اصلاحات کر کے لیپاپوتی کر لی جائے۔نہیں۔میٹر کی ایک صورت سے دوسری میں تبدیلی ایسی ہوتی ہے کہ ساری کیفیت ہی بدل جاتی ہے۔ایک جدید صورت کی فتح لازمی ہے۔اسے ٹوکا تو بہت جاتا ہے مگر اسے روکا نہیں جاسکتا۔

کمال بات یہ ہے کہ بے چین میٹر قدیم کو جدید میں بدل کر آرام نہیں کرتا بل کہ اب وہ پھر اسی ''جدید'' کو قدیم کرنے لگ جاتا ہےاور مزید جدید کی طرف بدل جاتا ہے..... یہ سلسلہ کبھی نہیں رکتا۔

اس کا ایک اور مطلب بھی ہے: دنیا کا، اشیا کا اور واقعات کا سب سے بڑا اور بنیادی قانون ''ارتقا'' ہے۔ارتقا ''خیر'' کا ''شر'' پر بھاری ہونا ہے۔باہم لڑتے ہوئے ارتقا میں خیر اور شر دونوں موجود ہوتے ہیں،مثبت اور منفی دونوں، ماضی اور مستقبل دونوں،قدیم اور جدید دونوں۔

مطلب یہ ہوا کہ کائنات میں کوئی شئے ایسی نہیں ہے جس کے اندر تضاد موجود نہ ہوں۔ مطلب یہ بھی ہوا کہ تضاد نہ ہو تو کسی شئے کا وجود بھی نہ ہو۔

اُسی تضاد سے ''اجتماعِ ضدین'' کا قانون نکلا۔مثال کے طور پر ''ایک'' چوبیس گھنٹے میں دو ضدیں ہوتی ہیں: دن اور رات۔ایک انسان میں مرد اور عورت دونوں کے کروموسومز موجود ہوتے ہیں۔'' ایک'' مقناطیس میں دو پول ہوتے ہیں: شمالی اور جنوبی۔ دونوں اکٹھے رہتے ہیں،ایک دوسرے کے لیے ضروری ہوتے ہیں،مگر یہ تو باہم متضاد قوتیں ہیں۔''ایک'' ایٹم کے اندر اس کے مرکزہ میں پازیٹو چارج ہوتا ہےاور اسی میں اس کے گرد بیرونی جگہ پر نیگیٹو چارج والے الیکٹرون رقصاں رہتے ہیں۔''ایک'' جنگ میں حملہ اور دفاع، پیش قدمی و پسپائی، فتح و شکست دونوں موجود ہوتے ہیں۔میتھ میں پلس اور مائنس، مکینکس میں عمل اور ردِعمل..... پھر نیک اور بد، دروغ اور راست، زند اور مرگ، رژن و تاریکی، کیپٹلسٹ اور پرولتاریہ، اوپر نیچے، خیر اور شر، دایاں بایاں، موت اور حیات، سبب اور نتیجہ، زوال و کمال، لاغر اور پہلوان، اٹریکشن اور ریپلشن، شمال اور جنوب، نر اور مادہ، طاق اور جفت، آسائش اور مشکل.....

اگر عہدِ فیوڈلزم کا ہے تو کسان کے بغیر جاگیردار کا وجود نہیں اور جاگیردار کے بغیر کسان

نہیں ۔ اگر کیپٹلزم ہے تو بورژوازی کے بغیر پرولتاری نہ ہوگا اور پرولتاریہ کے بغیر بورژوا کا وجود نہیں۔اسی طرح سماج اگر غلام داری ہے تو اس کی متضاد قوتیں آقا اور غلام ہیں۔

یہ متضاد قوتیں باہم دست وگریباں ہیں، مگر رہتی اکٹھے ہیں۔

ایک ہی جسم میں دو متضاد قوتیں.....مگر یہ لڑتے ہوئے بھی متحد رہتی ہیں۔ایک کے بغیر دوسرا وجود نہیں رکھ سکتا۔دونوں ایک ہی وجود میں بہ یک وقت متصادم بھی ہیں اور ایک دوسرے کے محتاج بھی.....اسے ''اجتماعِ ضدین'' کہتے ہیں۔

صرف اجتماع ضدین ہوتا تو کوئی خاص فرق نہ پڑتا یہاں تو اس اجتماعِ ضدین کے بیچ زبردست کشمکش بھی ہورہی ہوتی ہے۔کُشتی، جھگڑا، جنگ۔یہ ''رندولاشار'' آپس میں بھائی بھی ہیں مگر ایک دوسرے کی بیخ اکھاڑنے میں بھی لگے رہتے ہیں مگر یہ بیخ مکمل طور پر اکھڑتی کبھی بھی نہیں۔

یہ ضدین قانون کی عین مطابقت میں اکٹھے بھی رہتے ہیں اور برسرِ پیکار بھی رہتے ہیں۔ یہ قانون بڑی سے بڑی حقیقت سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے ''ایٹم'' تک پہ لاگو ہوتا ہے۔اور یہ لڑائی، یہ تضاد جس دن ختم ہوئی زندگی ختم ہوجائے گی۔دلچسپ ہے کہ ان میں سے ایک کی مکمل فتح دوسرے کی مکمل شکست کبھی نہیں ہوتی۔ان ہی مخالف تضادات کی کشمکش نے زندگی کے تخت کو اپنے کندھوں پہ اٹھائے زندہ رکھا ہوا ہے۔

ایک انفرادی زندگی اپنی حرکت میں موت تک پہنچ کر بہ ظاہر معدوم ہو جاتی ہے مگر یہ موت خود زمین میں دھنس کر نئی زندگیوں کو جنم دیتی ہے۔اُسی شکل میں نہیں مگر پریشاں عناصر کی ترتیب سے دوسری زندگی پیدا کرتی ہے۔

یہ کشمکش زندگانی، حیاتی اور دنیا کے ضامن ہوتے ہیں۔ہمہ وقت ہلچل، ہر لمحہ تخلیقیت سے چھلکتے ہوئے۔ہماری ساری ترقی، سارا ارتقا اس برسرِ پیکار اضداد کے اتحاد میں ہے۔

کبھی کبھی اِن جنگی فریقین کی طاقتوں میں توازن آجاتا ہے اور کوئی ارتقا وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ایک طرح کا توازن اور تعطل۔ہم اس کے لیے ایک حتمی لفظ استعمال کرتے ہیں: ''عارضی''۔ یہ خواہ ایک سیکنڈ کا ہو یا ایک صدی کا مگر ہوتا عارضی ہے۔لڑائی تو ہونی ہے۔

ہاں کبھی کبھی سماج ہمارے پاکستانی 70 سال کی طرح dull، بور، ساکت اور بے ذائقہ ہوجاتا ہے۔یہ عارضی (خواہ سیکڑوں سال کیوں نہ ہوں) صورت تب پیدا ہوتی ہے جب تضادات میں توازن پیدا ہوجاتا ہے۔

مطلب کہنے کا یہ ہے کہ آپ نے جس بھی چیز کو سمجھنا ہو، یا کسی مظہر کو جاننا ہو، یا پھر کوئی فکر معلوم کرنی ہو تو اس کے بیچ تضاد کو تلاش کیجیے، اس تضاد کی نوعیت معلوم کیجیے اور وہاں تضادات کی کشمکش کو جانچیے۔

ہر طرح کا سماج اور ہر طرح کا نظریہ اپنے اپنے تضادات رکھتے ہیں۔پراسیس تبدیل ہوتے جاتے ہیں۔پرانے پراسیس اور پرانے تضادات غائب ہوجاتے ہیں۔نئے پراسیس اور نئے متضاد ابھرتے رہتے ہیں اور اسی کی مطابقت میں تضادات کو حل کرنے کے طریقے بدلتے جاتے ہیں۔

ظاہر ہے میں اور آپ ہمیشہ جدید کا ساتھ دیں گے، ترقی پذیر کا ساتھ دیں گے۔ہم اس جدید اور ترقی پذیر کا ساتھ دو طرح سے دیں گے:

1۔نشوونما کے راستے میں رکاوٹیں دور کر کے۔

2۔اس ترقی یا نشوونما کے عمل کو تیز کر کے۔

تضاد کی قسمیں

1۔مخاصمانہ اور غیر مخاصمانہ تضادات

مخاصمانہ تضادات وہ ہوتے ہیں جو صرف انسانی ''سماج'' میں پائے جاتے ہیں اور یہ تضادات معاشی مخالف طبقات کے درمیان ہوتے ہیں۔ان میں مصالحت، give and take اور میڑھ مرکہ ناممکن ہوتا ہے۔ راضی نامہ اور مفاہمت خارج از امکان، اصلاح وریفارم بعید از قیاس۔ یہ ایسے بنیادی اور فیصلہ کن تضاد ہوتے ہیں جو موجود سماجی ڈھانچے کے اندر حل نہیں ہو سکتے۔ایسی شدید لڑائی کہ یہ صرف جنگ (سماجی انقلاب) سے حل ہوسکتے ہیں۔آج کی صورت حال میں سرمایہ داروں اور مزدوروں کے بیچ تضاد مخاصمانہ (معاندانہ) تضاد ہے۔

غیر مخاصمانہ تضادات مخالف طبقات کے درمیان موجود نہیں ہوتے۔ یہ ایسے تضادات ہوتے ہیں جو ایک ہی طبقے کے اپنے اندر موجود معمولی تضادات ہوتے ہیں۔یعنی مزدوروں اور کسانوں کے بیچ تضاد، مزدوروں کے اپنے اندر باہمی تضاد۔شہروں اور دیہات میں تضاد۔

ان تضادات کو حل کرنے کے لیے نہ جنگ کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ انقلاب کی۔

2۔بنیادی اور غیر بنیادی تضادات

بنیادی تضادات وہ ہوتے ہیں جو ترقی اور تبدیلی کے عمل میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ان کے حل ہونے سے دوسرے تمام تضادات خود بہ خود حل ہو جاتے ہیں۔ بنیادی تضاد کی

موجودگی اور نشو ونما دوسرے تضادات کی موجودگی اور نشو ونما کو متعین یا متاثر کرتی ہے۔

پرولتاریہ اور بورژوازی آج بنیادی تضاد ہیں اور دوسرے تضادات مثلاً فیوڈلزم کی باقیات کے طبقے اور بورژوازی کے بیچ یا کسان اور پیٹی بورژوازی کے درمیان، بورژوا ڈیموکریسی اور بورژوا فاشزم کے درمیان سب کے سب بنیادی تضاد سے متعین یا متاثر ہوتے ہیں۔

بنیادی تضاد فیصلہ کن اور رہنمایانہ رول ادا کرتا ہے اور بقیہ ثانوی اور ماتحت پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ایک بار جب بنیادی تضاد ہاتھ آجائے اور اسے حل کر دیا جائے تو سارے مسائل یک دم حل ہو جائیں۔کیپٹلزم میں کارخانے اگر نجی ملکیت سے نکال کر پبلک ملکیت میں جائیں تو کیپٹلزم کے باقی تمام تضادات (غیر بنیادی) خود بہ خود حل ہو جاتے ہیں۔

کوالی ٹیٹو انداز کے تضادات صرف اور صرف کوالی ٹیٹو طریقے سے حل ہو سکتے ہیں۔ پرولتاریہ اور بورژوازی کے بیچ تضاد کوالی ٹیٹو ہے، اس لیے یہ صرف سوشلسٹ انقلاب سے حل ہوسکتا ہے۔ فیوڈلزم اور عوام الناس کے درمیان تضاد کوالی ٹیٹو ہے، اسے ڈیموکریٹک انقلاب سے حل کیا جاسکتا ہے۔امپیریلزم اور کالونی کے درمیان تضاد کوالی ٹیٹو ہے، یہ صرف قومی انقلاب سے حل ہوسکتا ہے۔

لیکن سوشلسٹ سماج میں ورکنگ کلاس اور کسان کلاس کے بیچ تضاد زراعت کو مشینی بنانے اور اجتماعی بنانے سے حل ہو جاتا ہے۔سنگت اکیڈمی آف سائنسز کے اندر تضاد کرٹسزم اور سیلف کرٹسزم کے ذریعے حل ہو جاتا ہے۔

سماج اور نیچر کے بیچ تضاد پیداواری قوتوں کو ترقی دینے سے حل ہو جاتا ہے۔

کبھی بھی تضادات کو مساوی نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہر وقت بنیادی اور ثانوی تضادات میں فرق کرنا چاہیے۔البتہ یہ ضروری نہیں کہ ایک وقت کا بنیادی تضاد ہر وقت بنیادی ہی رہے۔کبھی کبھی وہ ثانوی بن جاتا ہے۔اسی طرح کبھی کبھی ثانوی تضاد بنیادی تضاد بن کر سامنے آتا ہے۔ جیسے کہ فیوڈل سماج میں کیپٹلزم ایک ماتحت قوت تھا، مگر وہ کیپٹلسٹ سماج میں نمایاں قوت بن جاتا ہے۔اسی طرح کیپٹلسٹ سماج میں فیوڈلزم نمایاں کے بجائے اب ثانوی تضاد بن جاتا ہے۔

کبھی کبھی بنیادی تضاد دھند میں ہوتا ہے۔انقلابی قوتوں کا عمل اس دھند کو چھٹا دیتا ہے اور وہ دھند والا تضاد، واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

سامنے سامنے

کیپٹلسٹ سماج میں فیوڈلزم نمایاں کے بجائے اب ثانوی تضاد بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی بنیادی تضاد دھند میں ہوتا ہے۔انقلابی قوتوں کا عمل اِس دھند کو چھٹا دیتا ہے اور وہ دھندلا تضاد، واضح ہو کر سامنے آجاتاہ

لہٰذا ساری جدوجہد اور ساری جنگیں، دراصل خیر وشر کے بیچ جدوجہد ہے۔یعنی چیزیں، اجسام اور حالات 'ارتقا مانگتے ہیں مگر ''شر'' کی قیادت میں ایک پوری رجمنٹ ایسا کرنے نہیں دیتی۔ لہٰذا دونوں کے بیچ ہمیشہ سے زندومرگ والی جدوجہد جاری ہے۔ اس جدوجہد کے اپنے اصول اور قوانین ہیں۔ان ہی قوانین کو اگر ''خیر'' نے سمجھ کر سوچ کر استعمال کیا تو جیت خیر (ارتقا) کی ہے اور اگر اُس کے دشمن نے اُن قوانین کو اچھی طرح سمجھا اور حالات پر ٹھیک ٹھیک اطلاق کیا تو وہ جیت جاتا ہے۔شر کی جیت ہوتی تو وقتی ہے مگر کبھی کبھی یہ ''وقتی'' وقت دہائیوں تک طویل ہوتا ہے۔کبھی کبھی جب دونوں اِن قوانین کو ٹھیک ٹھیک برتتے ہیں یا دنوں ہی غلط برتتے ہیں تو دونوں ہی برباد ہو جاتے ہیں اور یہ جاری کھیل ایک بار پھر نئے سرے سے شروع ہو جاتا ہے۔

یہ جو قوانین ہوتے ہیں ناں، یہ سو فیصد زمینی ہوتے ہیں، دنیاوی ہوتے ہیں۔یعنی ساری الائیں بلائیں یہیں سماج کی کوکھ سے ہی جنم لیتی ہیں۔رام اور راونڑ کی لڑائی جیسی اساطیری داستان میں خواہ جس قدر اساطیری آمیزشیں ہوں مگر پوری طویل جنگ دنیاوی قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔یعنی قوانین صرف اور صرف دنیا کے ہوتے ہیں، دنیا اور کائنات سے باہر کے بالکل بھی نہیں اور یہ قوانین جنم بھی دنیا کے اندرونی تضادات سے لیتے ہیں۔

جب آپ سماج میں تبدیلی کے موضوع پہ بات کر رہے ہیں تو اصل میں آپ سماج کے متعلق بات کر رہے ہیں اور سماج کا سیکریٹری جنرل تو انسان ہے۔انسان، متحرک اور تخلیقی انسان۔ یہ انسان معاشی سرگرمیاں کرتا ہے، اُس سے سماجی معاملات پیدا ہوتے ہیں اور سیاست پیدا ہوتی ہے۔یعنی انسانی معاشی سرگرمی، دنیا میں خیر وشر کی ہر لڑائی کا مرکزہ ہوتی ہے۔

معاشی سرگرمی ایک معاشی نظام کو جنم دیتی ہے۔اِس معاشی نظام میں معاشی طبقات پیدا ہوتے ہیں، اِن طبقات میں باہمی تضاد ہوتے ہیں اور ان ہی تضادات سے طبقاتی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ساری سیاست، صحافت، ثقافت، اخلاق، ہلاکت اسی طبقاتی کشمکش کے حاملہ پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں۔

سادہ بات یہ ہے کہ سارا جھگڑا، ساری تقریریں، ترانے گانے اس بات سے وابستہ ہیں کہ جس جگہ پیداوار ہوتی ہے وہ پیداواری جگہ (فیکٹری، کھیت) ملکیت کس کی ہے؟ آیا وہ مشترکہ ہے یا شخصی؟ اگر پیداوار کی جگہ زمینیں ہیں اور وہ زمینیں ایک شخص کی ہیں اور بقیہ آبادی محض کسان اور بزگر ہے تو وہ نظام فیوڈل کہلائے گا۔اسی طرح اگر پیداوار فیکٹری اور کارخانے میں ہوتی ہے اور اگر اُس کی ملکیت نجی ہے تو اسے کپٹلزم کہتے ہیں۔

اس لیے سماج کے معاشی نظام اور اس معاشی نظام کے تضادات کو تلاش کرنا اور معاشی نظام کے طبقات اور ان کی باہمی کشمکش کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

یہاں دیکھیے تو ہمارے سماج کا انتظام جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔ اس سماج میں دوسرا حصہ مزدور، کسان، ماہی گیر، اور چرواہوں جیسے محنت کرنے والوں پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں طبقات، مفاد کے لحاظ سے ایک دوسرے سے متضاد ہیں متصادم ہیں۔ان ہی تضادات کی وجہ سے یہ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہیں۔

یہاں ایک اور بات کا تذکرہ بھی ضروری ہو جاتا ہے: سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی۔اُس میں بھی بس ایک بات: سائنس اور ٹکنالوجی خواہ کم ترقی یافتہ ہوں یا زیادہ، یہ آلے ہوتے ہی بورژوازی کے ہیں۔اِدھر اُدھر کے معمولی یا غیر معمولی اثرات کے باوجود یہ طبقاتی پوزیشنوں میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں لاتے۔سائنس وٹکنالوجی خواہ جتنی ترقی کرے، مگر محض ''اس'' کے زور سے سماج میں مراثیوں کے بچے پنڈ کے چودھری نہیں بن سکتے۔

محنت کرنے والوں اور مالکوں کے اندر پیدا ہونے والے تضادات ہمیشہ اپنا اظہار طبقاتی مفادات کے تصادم کے بہ طور کرتے ہیں۔محنت کرنے والوں میں شعور آجاتا ہے۔وہ نجات

کے نظریات کی تلاش میں ہوتے ہیں اور پھر وہ متحدہ طور پہ اس شعور و نظریات کی قیادت میں مالک طبقات سے بھڑ جاتے ہیں۔ محنت کرنے والے چاہتے ہیں کہ نجی ملکیت کے خاتمے سے وہ جبر واستحصال کی زنجیریں توڑ دیں اور سماجی قوتوں کی از سرِ نو تنظیم کریں اور اس تصادم کا بلند ترین اظہار سماجی انقلاب ہے۔

اِس طویل طبقاتی لڑائی میں دانش ور، ادیب، شاعر اور انٹیلی جنشیا کا رول بنیادی نہیں ہے۔ مارکسسٹ دانش ور البتہ طبقاتی سیاست میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور بورژوا دانش ور اَن پڑھ اکثریت والے محکوم طبقے کو گمراہ کرتے ہیں، وہ اُن دونوں طبقات کے مفادات کے ٹکراؤ کو چھپاتے ہیں اور سماج میں طبقات کی بنیاد پہ موجود تضادات کو گُند کرتے ہیں۔ ایمان دار اور عوامی دانش ور جتنا زیادہ زور آور اور زیردست طبقات کے درمیان مفادات کے تضاد کے انکشاف پر زور دیں گے، اتنی ہی جلد طبقاتی تضاد آگے بڑھے گا اور محنت کش اپنے طبقاتی شعور کی مدد سے اپنے طبقاتی دشمن کو شناخت کر لیں گے۔

3۔ اندرونی تضاد اور بیرونی تضاد

اصل اہمیت اندرونی تضادات ہی کی ہے۔ سماج کے اندر طبقاتی تضاد اہم ہے اور بیرونی تضاد معاون تو ہوسکتا ہے فیصلہ کن نہیں۔ انقلاب کبھی بھی بیرونی طرف سے، اوپر سے، خواہش سے، پہلوانی سے، دعا سے اور حکم سے نہیں لایا جاسکتا۔ خواہ سوپر پاور بھی آپ کے ساتھ ہو۔ اگر اندرونی طبقاتی بنیادی تضاد کی گہرائی موجود نہ ہو تو انقلاب نہیں آسکتا، آ گیا تو مستحکم نہیں رہتا۔

بلوچستان میں قبیلوی سماج کی باقیات ابھی جان دار طریقے سے موجود ہیں۔ جو تیزی کے ساتھ فیوڈلز میں ڈھلتا جارہا ہے۔ یعنی قبیلوی اور فیوڈل تضادات بھرپور طور پر موجود ہیں۔ یہاں متوازی صورت میں کپٹلزم (معدن، ماہی گیر، ریل و بجلی اور پوسٹ اور مسافر و گڈز ٹرانسپورٹ) موجود ہے۔

اسی طرح بلوچستان کا ایک تضاد پنجاب یا وفاق سے ہے۔ بہت زوردار تضاد۔ اسی

طرح بین الاقوامی سام راج سے بھی تضاد موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں عوام اور سردار کے بیچ، کسان اور فیوڈل کے درمیان، مزدور اور سرمایہ دار میں، پنجاب اور بلوچ عوام کے درمیان اور بین الاقوامی سامراج اور بلوچ کے درمیان بنیادی تضاد موجود ہے۔ اِن سب کو حل کیے بغیر سماج آگے نہیں بڑھ سکتا۔

بیرونی تضاد مگر، قطعاً غیر متعلق بھی نہیں ہوتے۔ یہ نشوونما، ارتقا اور تبدیلی میں مددگار بھی ہوسکتے ہیں، رکاوٹ بھی بن سکتے ہیں۔ مثلاً امریکی سام راج گزشتہ سو برسوں سے کام یابی کے ساتھ بے شمار ممالک کے خلاف اپنی کاروائیوں سازشوں، معاشی ناکہ بندیوں سے ان ممالک کا گھلا گھونٹے رکھتا ہے، انھیں آگے بڑھنے ہی نہیں دیتا۔ کیوبا کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اسی طرح افغانستان کے انقلاب کا گلہ سعودی عرب، پاکستان، ایران، امریکا اور یورپ نے مل کر گھونٹ دیا۔ اس لیے بیرونی تضاد کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

سوویت یونین اور سوشلسٹ ممالک کے خاتمے کے بعد سے دنیا میں تین بڑے تضادات موجود ہیں۔ ہمیں دنیا کو سمجھنے کے لیے اُس میں موجود تینوں بڑے تضادات کو دیکھنا ہوگا۔ یہ تضادات سیاسی سماجی ورکر اور دانش ور کو حفظ ہونے چاہئیں۔ ان میں سے کسی بھی ایک تضاد کو نظر انداز کرنے سے دنیا کی سمجھ نہیں آسکتی۔ دنیا میں رونما ہونے والے سارے بڑے سیاسی فوجی اور معاشی واقعات کی تہہ میں یہی تین تضادات موجود ملیں گے۔ یہ ایسے تضادات ہیں جو بنیادی بھی ہیں اور جنگ کے بغیر اُن کا حل بھی کوئی نہیں۔

پہلا تضاد:

طاقت ور کپٹلسٹ ملکوں کے اپنے مابین ایک طاقت ور تضاد موجود ہے۔ اُن کے بیچ تضاد اس بات پہ ہے کہ دنیا کی لوٹ مار میں کس کا حصہ کم ہو اور کس کا زیادہ۔ ہر سام راجی ملک یہ چاہتا ہے کہ غریب ممالک کے وسائل کی لوٹ میں اُس کا حصہ دوسرے سے زیادہ ہو۔ یہ تضاد اس قدر سنگین ہے کہ ماضی میں لوٹ میں حصہ بڑھانے کے چکر میں سرمایہ دار ممالک نے آپس میں زبردست جنگیں لڑی ہیں۔ اس تضاد کے سبب چھوٹی موٹی تو بے شمار جنگیں ہوئیں لیکن اس بڑے

تضاد نے دنیا کو دو بڑی عالمی جنگوں تک میں جھونک دیا تھا۔ ایک دوسرے کو ایٹم بم تک مارے تھے۔

دوسرا تضاد:

کم زور ملکوں کا سامرز جی ملکوں کے ساتھ تضاد ۔کم زور ملک کا ارمان ہے کہ اس کی معاشی اور سیاسی خودمختاری بحال ہو۔ وہ اپنے وسائل دوسرے طاقتور ملکوں کو چھیننے نہ دے، بل کہ اپنے غریب عوام پر خرچ کرے مگر طاقت ور ملک ایسا کرنے نہیں دیتے۔

تیسرا تضاد:

ہر ملک کے اپنے اندر، وہاں کے حکم ران طبقے کا اپنے محنت کش طبقات سے تضاد موجود ہے۔ بالادست طبقہ طاقت اور استادی استعمال کر کے ملک کے وسائل لوٹ کر اور مزدور کی محنت کا استحصال کر کے اپنی دولت بڑھاتا ہے۔ مگر نچلا محکوم طبقہ ان تھک مشقت کے باوجود سُکھی زندگی کے لیے ترستا رہتا ہے۔ اس کے پاس رہنے کو گھر نہیں ہے، روزگار نہیں ہے، تعلیم و صحت نہیں ہے۔ اس کے باوجود کہ سائنس اور ٹکنالوجی نے پیداوار کے ڈھیر لگا رکھے ہیں۔ مگر سب کچھ جاگیردار کا، زردار کا۔ یہ تضاد طبقاتی تضاد کہلاتا ہے۔

کوانٹیٹی اور کوالٹی

Quantity & Quality

یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ دنیا تیار اور مکمل کردہ چیزیں نہیں رکھتی۔ دنیا تو اُن پراسیسوں کی کُل حاصل کی نمائندگی کرتی ہے جو مستقل طور پر تبدیل ہو رہے ہیں، وجود میں آ رہے ہیں اور تباہ ہو رہے ہیں۔

ترقی کا عمل فوری بھی نہیں ہے اور ایک سیدھی لکیر کی طرح بھی نہیں ہے۔ بل کہ اُس میں عرصے تک چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ انھیں ہم کوانٹی ٹیٹو تبدیلیاں کہتے ہیں۔ اُس مرحلے کے بعد یکا یک تیز رفتار اور دھماکہ خیز تبدیلی کے ادوار آتے ہیں جن میں کوانٹٹی، کوالٹی میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔

یعنی تغیر یا تبدیلی دو قسم کی ہوتی ہے۔ جب کوئی چیز اپنی اصل صورت میں رہ کر بدلتی جاتی ہے تو اُسے ''کوانٹی ٹے ٹو'' (مقداری) تبدیلی کہتے ہیں۔ جب وہ چیز مقداری تبدیلیوں کے نتیجے میں اپنی صورت بدل کر بالکل صورت ہی دوسری اختیار کر لیتی ہے تو اسے ''کوالی ٹے ٹو'' تبدیلی کہتے ہیں۔

اس سارے قانون کو ''کوانٹٹی کی کوالٹی میں تبدیلی'' کا اصول کہتے ہیں۔

کوالٹی

کسی شئے کی لازمی خاصیت کی وجہ سے ہی یہ وہی شئے رہتی ہے اور کوئی دوسری نہیں بنتی۔

کسی شئے کی کوالٹی اس کی الگ الگ خصوصیات میں کم نہیں کی جاسکتی۔کوالٹی مجموعی طور پر شئے کے وجود کے ساتھ مکمل طور پر جڑی ہوتی ہے اور اُس سے علیحدہ نہیں کی جاسکتی۔یہی وجہ ہے کہ کوالٹی کا تصور ایک شئے کے وجود سے جڑا ہوتا ہے۔ایک شئے خود کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی کوالٹی ضائع نہیں کرسکتی۔

کوالٹی وجود کی حالت کا پیمانہ ہوتی ہے۔فلاں چیز کس طرح بنی، یا وہ دوسری چیزوں سے کیسے مختلف ہے۔کوالٹی کی ڈیفی نیشن یہ ہے کہ یہ ایک مخصوص خصوصیت ہے۔اس کی مثالیں ہم دردی، سچائی، خوب صورتی وغیرہ ہیں۔

کسی شئے میں ممکن نہیں کہ صرف کوانٹیٹی ہو اور کوالٹی نہ ہو۔اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی شئے صرف کوالٹی رکھے اور کوانٹیٹی کے بغیر ہو۔یہ دونوں بہ یک وقت موجود ہوتی ہیں۔

اگر سماجی طور پر دیکھیں تو قدیم کمیونزم کی کوالٹی اور خصوصیت یہ تھی کہ ملکیت مشترک تھی، محنت بھی مشترک تھی اور اُس سے حاصل شدہ پیداوار بھی مشترک تھی۔غلام داری میں ملکیت تو آقا کی ہوتی تھی مگر محنت غلام کرتا تھا، اور پیداوار آقا کی ہوتی تھی۔فیوڈلزم کی خاصیت یہ تھی کہ ملکیت فیوڈل کی ہوتی تھی، مظالم اُسی کے، محنت اور عدم آزادی کسان کی ہوتی تھی اور پیداوار فیوڈل کی۔ کیپٹلزم کی کوالٹی یہ ہے کہ وہاں سب کچھ کا مالک کیپٹلسٹ ہے اور ساری محرومی مزدور طبقے کی۔

کوالٹی کبھی بھی لولا کی نہیں ہوسکتی۔نہ یہ ہر جگہ کے لیے یونیفارم ہوگی۔مثلاً اگر آپ دراز قدی کی بات کریں تو لمبے قد والے امریکیوں میں دراز قدی کا تصور کچھ اور ہوگا اور کوتاہ قد تھائی لینڈ والوں میں دراز قدی کچھ اور جانی جائے گی۔

اسی طرح حُسن کے بارے میں افریقا اور یورپی لوگوں میں الٹ تصور موجود ہے۔

آپ فرماں برداری کی بات کریں تو ہر معاشرے میں وہ مختلف ہوگی۔آپ رحم دلی، وفاداری اور حب الوطنی کی بات کریں تو اُس کے معیار ہر جگہ مختلف ہوتے ہیں۔لیکن اگر یہی باتیں آپ کوانٹی ٹیٹو انداز میں کریں تو ایگزیگٹ اور عالم گیر بات ہوجائے گی۔

کوانٹیٹی

ساری اشیا کوالی ٹیٹو قطعیت کے ساتھ ساتھ کوانٹی ٹیٹو قطعیت بھی رکھتی ہیں۔ساری اشیا ایک واضح ڈیل ڈول، تعداد اور حجم رکھتی ہیں۔کوانٹیٹی تو مقررہ حد، سائز، یا کسی چیز کا کُل میزان ہوتی ہے۔کوانٹیٹی کو گنا جاسکتا ہے، یا ناپا جاسکتا ہے یا تولا جاسکتا ہے اور اس کا اظہار نمبرز میں کیا جاتا ہے۔فلاں کا قد میٹروں سنٹی میٹروں میں کتنا ہے؟ اُس بوری کا وزن کتنے کلوگرام ہے۔

کوالٹی کے برعکس کوانٹیٹی ایک شئے کے وجود کے ساتھ بہت زیادہ جڑی نہیں ہوتی۔

کوالٹی سب جیکٹو ہے مگر کوانٹیٹی سب جیکٹو نہیں ہوتی۔

یہ بھی اصول ہے کہ کوانٹیٹی، کوالٹی میں بدل جاتی ہے اور کوالٹی، کوانٹیٹی میں۔کوانٹیٹی سے کوالٹی میں ڈھل جانا ایک بنیادی قانون ہے۔یہ جدید کے نمودار ہونے کا قانون ہوتا ہے، ترقی کا قانون ہوتا ہے۔یہ قانون بتاتا ہے کہ ایک کوالٹی سے دوسری کوالٹی میں لپک کر ڈھل جانے کا پراسیس کیا ہوتا ہے۔مگر یہ تبدیلی کبھی بھی حادثاتی نہیں ہوتی۔یہ ایک پراسیس کے نتیجے میں برپا ہوتی ہے جس کے قوانین موجود ہیں۔

ہر شئے دوسری اشیا سے ہزاروں دھاگوں سے بندھی ہوئی ہوتی ہے۔یہ اُن کے ساتھ گوناگوں رشتوں میں منسلک ہوتی ہے۔

جیسے کہ ذکر ہوا کہ جب کوئی چیز اپنی اصل صورت میں رہ کر قطرہ قطرہ بدلتی جاتی ہے تو ایسی تبدیلی کو کوانٹی ٹیٹو تبدیلی کہتے ہیں اور یہ قطرہ قطرہ تبدیلی سطح کے نیچے ہوتی رہتی ہے۔لیکن اگر ان قطرہ قطرہ تبدیلیوں کے نتیجے میں بالآخر اس کی حالت ہی بدل جاتی ہو تو وہ کوالی ٹیٹو تبدیلی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ کوانٹی ٹیٹو تبدیلیاں شئے کی تباہی کی طرف یا لازمی تبدیلی کی طرف یک دم نہیں لے جاتیں بل کہ ہر شئے کے لیے صرف ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد ہی کوانٹی ٹیٹو تبدیلیاں کوالی ٹے ٹو تبدیلیاں لاتی ہیں۔

پانی کو لیکوئڈ سے گیس یعنی بھاپ بنانا ہو تو اسے حرارت دینا پڑتی ہے۔یہ پانی یک دم

نہیں کھولتا۔ اُس کا تو ایک ایک مالیکیول گرم ہو جاتا ہے۔ وہ گرم مالیکیول انرجی حاصل کرتا ہے اور اوپر کی جانب حرکت کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کی خالی کردہ جگہ دوسرا ٹھنڈا مالیکیول لے لیتا ہے اور پھر وہ بھی گرم ہو کر اوپر جاتا ہے۔ یوں کوانٹیٹی بدلتی جاتی ہے۔ بالآخر 100 ڈگری سیلسی اُس پہ جب سارے مالیکیول گرم ہو جاتے ہیں، تب پانی یک لخت چھلانگ لگا کر جوش کرنے لگ جاتا ہے اور اپنی صورت تبدیل کر کے یہ پانی گیس یعنی بھاپ کی شکل اختیار کرے گا۔ یہ ہے کوالی ٹیٹو تبدیلی۔ یعنی اب تک جو چیز پانی تھا اُسے پیا جا سکتا تھا، کپڑے اور برتن دھوئے جا سکتے تھے۔ اُس کے اندر انگلی گھمائی جا سکتی تھی مگر اب اس کی کوالٹی بدل گئی۔ یہ اب بھاپ بن گیا۔ بھاپ' پانی والے کام نہیں کر سکتی۔ خصوصیت ہی بدل گئی۔

اسی طرح اگر پانی کو ٹھنڈا کرتے جائیں تو بالآخر وہ پانی نہیں رہتا، ٹھوس یعنی برف بن جاتا ہے۔ اِس صورت میں اب پانی سے برف (ٹھوس) بنی ہوئی شئے کی خاصیتیں پانی والی نہیں رہیں۔

کوانٹی ٹیٹو رشتوں کا مطالعہ میتھے میٹکس کرتا ہے۔

ایک اور قانون بھی ہے۔ وہ یہ کہ جب کوانٹی ٹیٹو تبدیلی آ رہی ہو تو شروع میں اُس کی رفتار کم ہوتی ہے۔ جس میں پہلے پہل تو معمولی اور ناقابلِ مشاہدہ مقداری تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ مثلاً پانی کو گرم کرتے ہوئے یہی کچھ ہوتا ہے۔ البتہ جب سارے مالیکیول گرم ہو جاتے ہیں تو کوانٹی ٹیٹو تبدیلی کی رفتار بہت تیز ہوتی جاتی ہے اور کوالی ٹیٹو تبدیلی کے وقت تو یہ رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔

اور اس سے بھی ایک دلچسپ قانون یہ ہے کہ کوالی ٹیٹو تبدیلی کے لیے آخری مالیکیول کا گرم ہونا بھی لازمی شرط ہوتی ہے۔ ورنہ یہ تبدیلی ممکن نہیں۔

ہر شئے ہر وقت پراسیسوں کے ایک سلسلے میں ہوتی ہے۔ پراسیسز ایک مرحلہ تک آتے ہیں تو شئے کی صورت بدل جاتی ہے اور پھر اگلا مرحلہ شروع ہوتا ہے، پھر اگلا، پھر اگلا.....

قدیم کمیونزم سے ارتقا یافتہ اگلے نظام یعنی غلام داری سماج کی ہم سب توصیف کرتے ہیں۔ تاریخ میں سارے لوگوں نے دنیا میں بادشاہت ختم کر کے سرمایہ دارانہ نظام قائم کرنے کی

حمایت کی تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ کر کے سوشلزم کا قیام ہر ایک کو اچھا لگا تھا۔ یہ ساری تبدیلیاں یعنی قدیم کمیونزم سے فیوڈلزم تک اور فیوڈلزم سے کیپٹلزم تک اور پھر کیپٹلزم سے سوشلزم تک مکمل طور پر کوانٹیٹی اور کوالٹی کے قانون کے مطابق ہوتی رہی ہیں۔

یہاں ایک اور قانون بھی موجود ہے۔ کوانٹی ٹیٹو تبدیلی مسلسل اور ترتیب کے ساتھ چلتے چلتے جب عروج پر پہنچتی ہے تو کوالی ٹیٹو تبدیلی ایک چھلانگ کی صورت رونما ہوتی ہے۔ تب یہ بہت تیز رفتار تبدیلی ہوتی ہے۔ یہ جو یک لخت صورت کا بدل جانا ہے۔ یہ اہم قانون ہے۔ اگر ہم اس قانون کا اطلاق کسی انسانی معاشرے پہ کریں تو اس کوالی ٹیٹو تبدیلی کو انقلاب کہتے ہیں۔ ایسا انقلاب، فرنچ انقلاب کے وقت ہوا تھا۔ اسی طرح 1917ء میں روس کے اندر بھی یہی کوالی ٹیٹو تبدیلی آئی تھی۔ مطلب یہ کہ انقلاب بغیر چھلانگ کے کبھی نہیں آتا۔

چناں چہ چھلانگ کو نظر انداز کر کے صرف کوانٹی ٹیٹو تبدیلیوں پر آسرا رکھنا غلط بات ہے۔ اسی طرح کوانٹی ٹیٹو کو رد کر کے ہمہ وقت چھلانگوں کی بات کرنا بھی غلط ہے۔ اس آخری بات کا مطلب یہ ہے کہ انقلابی تنظیم کے طویل اور دِقت طلب کام یعنی لوگوں کو باشعور بنانے، انھیں منظّم کرنے اور انقلابی عمل کے لیے بہ تدریج تیار کرنے کا کام ہرگز مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ یہی تو راستہ ہے جو چھلانگ تک لے جاتا ہے۔

ہاں، مگر کوانٹیٹی اور کوالٹی والے اس قانون سے ہٹ کر، پارٹی انقلاب نہیں لا سکتی۔ نہ کوئی مہا عقل مند، کوئی پہلوان اور صلاحیتوں بھرا لیڈر یہ کام کر سکتا ہے۔ یہ کوالٹی' کوانٹیٹی کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ اسی لیے یہ طے بات ہے کہ تبدیلی کسی عظیم آدمی یا اتفاقیہ واقعے پر نہیں آتی۔ یہ مکمل طور پر قوانین کے تابع کام ہے۔ قوانین بتاتے ہیں کہ کوانٹی ٹیٹو تبدیلیاں لازم ہیں اور ''کوالی ٹیٹو'' تبدیلیاں لازم ہیں۔ یہ دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر ''کوانٹی ٹیٹو'' پہ زور دے کر انقلاب کو نظر انداز کرنا غلط ہے تو انقلاب انقلاب کہہ کر ''کوانٹی ٹیٹو'' ارتقا سے انکار بھی غلط ہے۔ سماجی انقلابات ناگزیر ہیں۔ اس لیے کہ انقلاب مزدور طبقے کی تلخ زندگانی کے پروسیس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پھر وہی کوانٹیٹی اور کوالٹی کا قانون! مزدوروں کی زندگی عذاب بنتے بنتے جب آخری

درجے پر پہنچتی ہے تو وہ اپنی سیاسی پارٹی کے گرد جمع ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور وہ سماج کو کوالی ٹیٹو تبدیلی کی طرف لے جاتے ہیں۔ The last straw That breaks camel's back (مطلب لادتے جاؤ، لادتے جاؤ مگر جب برداشت کی آخری حد تک پہنچ جاتی ہے تو آخری تنکے پہ اونٹ کی کمر ٹوٹ جاتی ہے) یا جیسے ایوب کے زمانے میں جب معاملات عوام کی برداشت سے زیادہ بگڑ گئے تو چینی کی قیمت میں محض چار آنے کے اضافہ نے ملک گیر ہڑادھڑی پیدا کر دی تھی اور ایوب کا تختہ ہو گیا تھا۔

بعض انقلابات کوانٹی ٹیٹو تبدیلی کے پراسیس میں نسبتاً کم وقت میں آجاتے ہیں اور بعض بہت وقت لیتے ہیں۔ سماج کے بے شمار فیکٹرز اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ہوگا؟ ظاہر ہے کہ خود کار انداز سے نہیں۔ تاریخ کی پیش قدمی کوئی میکانکی سلسلہ عمل نہیں ہوتا۔ معروضی اعتبار سے ابھرتی ہوئی قوتوں کو بھی کچھ عرصہ کے لیے روکا جا سکتا ہے اور حالاں کہ یہ صحیح ہے کہ بالآخر فتح اُن ہی کی ہوگی، مگر دیکھنا یہ ہے کہ انسانیت کو کتنی قربانیاں دینا ہوں گی، اُسے کتنی اذیتیں سہنا ہوں گی، کتنا وقت حاصل کیا جائے گا یا پھر کھو دیا جائے گا، اس سے پہلے کہ قدیم عہد اپنا زمانہ حمل مکمل کرے اور تاریخ کے متعین شدہ وارث جنم دے، اِن سب کا انحصار اس بات پر ہے کہ متضاد طبقات کی نسبتی طاقت کیا ہے اور وہ کتنے شعور کے ساتھ تاریخ کی پیش قدمی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

لیکن کہیں بھی عوام کے مقدر کا فیصلہ اُس کے حکم ران طبقوں کے ہاتھوں میں نہیں ہوتا۔ یہ ضرور ہو سکتا ہے اور ہوتا بھی ہے کہ اپنی بقا کے لیے حکم ران طبقے عوام کے مقدر کے حصول میں کچھ عرصہ کے لیے رکاوٹیں پیدا کریں لیکن تاریخ میں اس سچائی کے بہت سے دلائل ملتے ہیں کہ جب کسی حکمران طبقے کو نئی تاریخی قوتیں للکارتی ہیں تو اُس طبقے کے قدامت پسند تقاضے اُس کی بینائی پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور یوں وہ تاریخ کے ہم عصر تقاضوں کو نہیں پہچان سکتا۔

اس سلسلے میں عوامی دانش ور کے کرنے کے کام یہ ہیں: تاریخ کی ترقی پسند قوتوں کے ساتھ کام کرنا، ان پہ پرانے عہد کی مہلک اصلیت کو واضح کرنا اور معاشرے میں اُن قوتوں کی نشان

دہی کرنا جو پرانے عہد کو برقرار رکھنے میں کوشاں ہیں۔ تاریخ کی عقلی پیش قدمی کے بارے میں لوگوں کو بینائی عطا کرنا ہوتا ہے۔ اُنھیں یہ بتانا ہوتا ہے کہ سماجی رشتوں کا اگلا تاریخی درجہ حاصل کرنا کیوں ضروری ہے اور اُن کے وہاں تک پہنچنے کا راستہ کون سا ہے۔

ہر جگہ انقلاب ایک جیسا نہیں ہوتا۔ ہر ملک کے اپنے داخلی، خارجی، سماجی، معاشی اور سیاسی حالات ہوتے ہیں۔ مزدور کا شعور اور تنظیم کاری اور اتحاد، اسی طرح کپٹلسٹوں کی طاقت اور مزاحمت کی صلاحیتیں اور دیگر عوامل فیصلہ کن اثرات ڈالتے ہیں۔ سنگت اکیڈمی آف سائنسز، بلوچستان سنڈے پارٹی اور اُن سے وابستہ ساتھی اسی کوانٹیٹی والی تبدیلی سے کوالی ٹیٹو تبدیلی کے سفر میں نچلے طبقے کی قیادت اور مدد کرتے ہیں۔

یہ بات حتمی ہے کہ کپٹلزم سے سوشلزم میں کوالی ٹیٹو تبدیلی صرف ایک سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے ہی ہو سکتی ہے۔

قدیم کے پیٹ میں سے جدید کی حمایت کرنا قانون ہے۔ کوئی بھی سماجی نظام ''اٹل'' نہیں ہوتا۔ ہمیشہ نئے ابھرنے کے امکانات رکھنے والے طبقات پہ نگاہیں مرکوز رکھنی چاہئیں۔ مثلاً ہم سب کو معلوم ہے کہ ہمارے خطے میں مزدور طبقہ کم ہے، بے شعور ہے، غیر منظّم ہے اور اُس کی لیڈر شپ کرپٹ ہے مگر ابھرنا اسی طبقے نے ہے۔ سماج میں کوالی ٹیٹو تبدیلیوں کا ہراول دستہ یہی ہے۔

نفی کی نفی کا قانون

Negation of the Negation

ہم آپ گندم سے بہت واقف ہیں جو ہماری روزی ہے۔ ہم بلوچستان میں ہر سال نومبر کے آس پاس گندم کے دانوں کو بیج کے بہ طور زمین میں باقاعدہ دفن کر کے اس کی نفی کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر کچھ ہفتوں بعد پھر وہ دانہ نہیں رہتا۔ یعنی وہ دانے کی حیثیت سے اپنے اِس وجود کی نفی کرتا ہے اور پودے میں بدل جاتا ہے۔ یہی گندم کا پودا پھر مارچ کے اواخر میں مکمل طور پر اپنی نفی کرتا ہے اور بے شمار گندم کے دانے اور بھوسہ پیدا کر کے خود مر جاتا ہے۔

مگر گندم کے اسی نئے دانے میں پودے اور بیج والے دانے دونوں کا جوہر محفوظ رہتا ہے۔ قدیم جدید میں بدل جاتا ہے..... مگر سلسلہ یہاں رکتا نہیں بل کہ اب وہی جدید پھر اپنی باری پر بڈھا ہو کر ''جوانوں'' کو جنم دیتا ہے۔ ارتقا یہی تو ہے۔ سماجی نظام میں اس قانون کو لاگو ضرور کریں۔

اسی طرح انڈا دیکھیے۔ یہ ایک خاص وقت اور ٹمپریچر کے بعد اپنی نفی کرتا ہے۔ چوزہ نامی اثبات بنتا ہے۔ یہ چوزہ مرغی میں بدلتا ہے۔

غلام داری سماج کی نفی اُس کے اندر سے فیوڈلزم نے کی، فیوڈلزم کی نفی اُس کے اندر سے کیپٹلزم نے کی اور ہم نے دیکھا کہ اسی کیپٹلزم کے اندر سے اس کی نفی یعنی سوشلزم آیا۔

یہ نفی باہر سے انجیکٹ نہیں کی جاسکتی۔ نفی چیز یا مظہر کے اندر موجود ہوتی ہے۔ نگیشن قدیم سے جدید کی طرف عبور ہے اور یہ نفی کبھی بھی بے کار اور بے مقصد نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ سادہ

equation نہیں ہے کہ نفی میں سے نفی نکل کر پچھلی نفی کا سب کچھ برباد کر دے۔ نہیں۔ قانون یہ ہے: نئی نفی پرانی نفی سے اپنے لیے بہت سی کارآمد چیزیں لے کر اُس کی جگہ لیتی ہے۔ نئی نفی پرانی نفی سے اپنی بقا اور ترقی کے لیے کارآمد چیزیں لے کر آگے بڑھتی ہے۔ نفی کی نفی کا قانون سماجی بربادی کی طرف نہیں بل کہ سماجی نشوونما کی طرف بڑھتی ہے۔ ایسا کرنے کے پراسیس میں یہ نئی نفی خود پرانی ہوتی جاتی ہے اور اُس کی کوکھ سے خود اس کی نفی کی نشوونما شروع اور جاری رہتی ہے۔ مطلب یہ کہ نئی کو اپنی باری پہ بہر صورت نگیشن کا شکار ہونا ہوتا ہے۔ ہر نئی چیز ہمیشہ نئی نہیں رہتی بل کہ ارتقا کے سفر میں اپنا حصہ ڈال کر قدیم ہوتی جاتی ہے۔ ہوتے ہوتے یہی کوکھ والی نفی اپنی نشوونما میں ایک ایسی جگہ پہنچ جاتی ہے کہ اپنی ''ماں نفی'' سے اپنا توشہ لے کر، اُسے نفی کرتے ہوئے خود ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ جاتی ہے۔ اب وہ ''ماں نفی'' کی نسبت زیادہ جدید، زیادہ کارآمد اور زیادہ ارتقا پذیر بن کر آ گئی۔ دوسرے لفظوں میں نئی نفی نے پرانی نفی کو مکمل طور پر نیست و نابود نہیں کیا بل کہ اُس کی مضر چیزوں کو نیست و نابود کر دیا اور اپنی ترقی کے لیے پرانی نفی کے مفید عناصر کو ساتھ لے لیا۔ قانون: قدیم نفی کی بے کار شدہ چیزوں کو ''برباد'' اور کارآمد چیزوں کو ''برقرار'' رکھنا۔

استحصالی کیپٹلسٹ نظام ایک ایسے سوشلسٹ انقلاب سے ہٹا دیا جاتا ہے جو نفی کی نفی کرتا ہے، کیپٹلزم کے جوہر ہی کو یعنی بورژوازی کی طرف سے پرولتاریہ کے استحصال کو نفی کرتا ہے۔ مگر بہت عرصے سے پھیلائی ہوئی پاپولر غلطی کو درست کرنا ضروری ہے۔ درستی یہ ہے:

سوشلسٹ انقلاب بورژوازی نامی نفی کو مکمل برباد نہیں کرتا بل کہ مرتے ہوئے بورژوا سماج سے وہ چیزیں لے لیتا ہے جو سوشلسٹ انقلاب کی نشوونما میں مدد دیں۔

نفی کی نفی کے قانون کے نتیجے میں نشوونما ہوتی رہتی ہے مگر، نشوونما نہ تو سیدھی لائن میں ہوتی ہے اور نہ بند دائرے میں۔ نیچے سے اوپر کی طرف جاتی یہ نشوونما spiral انداز میں ہوتی ہے۔ یہ نشوونما پیچیدہ طریقوں سے، متضاد انداز میں بہت سے مڑے تڑے راستوں سے گزرتا ہوا نیچے سے اوپر کو جاتا ہے جن میں انفرادی مرحلوں میں رجعت پسند حرکت بھی شامل ہوتی ہے۔ انسانی تاریخ میں اس امتیازی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک فلاسفر نے کہا تھا کہ: ''عالمی تاریخ کے کاز کو کبھی کبھار پیچھے کی طرف بڑی پھلانگوں کے بغیر ہمیشہ ہموار طور پر آگے کی سمت بڑھتے سمجھنا غیر ڈائلک ٹیکل، غیر سائنسی اور نظریاتی طور پر غلط ہے۔''

فارم اور کانٹینٹ

ایک ماچس کے اندر موجود تیلیاں ''کانٹینٹ'' ہیں اور خود ماچس کی ڈبی ''فارم'' ہے۔ ماچس کی ڈبی اور تیلیاں ایک مخصوص شکل وصورت اور تعداد وترتیب میں بنی ہیں۔ ماچس کی ڈبی (فارم) کو محض اُس کی ظاہری شکل سے جانا نہیں جاسکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تیلیوں (کانٹنٹ) کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ تیلیاں (کانٹنٹ) فارم کے لیے فیصلہ کن ہیں۔ اگر ماچس کی ڈبیہ چالیس تیلیوں کی گنجائش والی ہے اور اس میں 200 تیلیاں ڈال دی جائیں تو ماچس یا تو پھٹ کر نئی شکل اختیار کرلے گی، اگر پھٹ نہ بھی جائے تو اُس کی صورت (فارم) بدل جائے گی۔

ماچس کی تو خیر ہے کہ اُس کی تیلیاں باہر سے ڈالی جاتی ہیں مگر اگر انڈے کی بات کی جائے تو معاملہ ذرا پیچیدہ ہوجاتا ہے۔ اس لیے کہ اُس کا چوزہ تو اندر سے بڑھتا رہتا ہے۔ انڈے کا شیل ''فارم'' ہوتا ہے اور اُس کے اندر چوزہ ''کانٹینٹ''۔ انڈے کے شَیل کے اندر چوزے کے لیے آرام دِہ سپس اور خوراک موجود ہوتی ہے۔ چوزہ اُس کے اندر پلتا پھولتا جاتا ہے۔ اس لیے کہ پلنا پھولنا چوزے کی خصوصیت ہے۔ انڈے کے شیل کے اندر ہی یہ سب کچھ ہورہا ہوتا ہے۔ مگر انڈہ بدقسمت ہے کہ کیلشیم کاربونیٹ سے بنا اُس کا شیل عورت کے پیٹ کی طرح الاسٹک نہیں ہوتا۔ انڈہ اگر بڑا ہوتے ہوئے چوزے کے ساتھ ساتھ خود اپنے شیل کو بھی پُھلا دینے کے قابل ہوتا تو شَیل کی تباہی نہ آتی مگر انڈے کی بدقسمتی یہ ہے کہ اُس کا شیل یعنی یا فارم تو اٹل، جامد، ساکن اور ناقابلِ تغیر ہے۔

ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ چوزے کے لیے جگہ کم پڑجاتی ہے تو اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ چوزہ بڑھنا بند کردے۔ اُس (کانٹینٹ) نے تو بڑھنا ہی ہے۔ چناں چہ ایک مرحلے پر جا کر چوزہ (کانٹینٹ) شیل (فارم) کو توڑ کر اور اسے برباد کر کے باہر نکل آتا ہے۔ مطلب فارم کو رضا کارانہ یا پھر بہ زورِ قوت کانٹینٹ کی بڑھوتری کو Facilitate کرنا پڑتا ہے۔ صرف وہی فارم بچ سکے گا جو ابھرتے، بڑھتے اور ارتقا کرتے کانٹینٹ کا ساتھ دے گا۔ وگرنہ نشوونما کرتے کرتے کانٹینٹ، فارم کو بدل ڈالتا ہے۔ یعنی کانٹینٹ' فارم کا تعین کرتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں کانٹینٹ اُن عناصر اور پراسیسوں کا کُل ہے جو چیزوں کی بنیاد بناتے ہیں اور جو اُن کے فارموں کے وجود، ڈولپمنٹ اور تواتر کو متعین کرتے ہیں۔

فارم، تنظیم کا داخلی کنکشن اور میتھڈ بناتا ہے۔ یہ فنامنا کے عناصر اور پراسیسوں کا آپس میں اور انوائرمنٹ کے ساتھ انٹرایکشن ظاہر کرتا ہے۔ اسی لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ صرف کانٹینٹ ہی اہم ہوتا ہے بل کہ سچی بات یہ ہے کہ اگر فارم مطابقت والا ہو تو کانٹینٹ کی ترقی کو بھی زبردست مدد دیتا ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ فارم اور کانٹینٹ اشیا کے اتحاد، سالمیت اور نشوونما کے داخلی سرچشموں کو ظاہر کرتے ہیں۔ چناں چہ فارم اور کانٹینٹ الگ الگ چیزیں ہوتے ہوئے بھی ایک وحدت ہوتے ہیں۔ کانٹینٹ کے بغیر فارم نہیں اور فارم کے بغیر کانٹینٹ نہیں۔ فارم' کانٹینٹ کی نمائندگی کرتا ہے۔ کانٹینٹ فیصلہ کن، مگر فارم بھی جب تک فعال رہتا ہے، مؤثر ہی رہتا ہے۔

فارم گو کہ کانٹینٹ پہ انحصار کرتا ہے مگر یہ بہت سرگرمی کے ساتھ کانٹینٹ پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ وہ اس کی نشوونما میں مدد بھی دیتا ہے۔ انڈے کا شیل محض کانٹینٹ یعنی چوزے کا حفاظتی قلعہ ہی نہیں ہوتا بل کہ یہ اسے باہر سے ہوا اور نمی بھی مہیا کرتا رہتا ہے۔ مگر یہ حتمی بات ہے کہ ایک جگہ جا کر فارم' کانٹینٹ کی لامحدود ڈویلپمنٹ کے امکان کا ساتھ دینے سے قاصر ہوجاتا ہے۔ تب وہ اُس کی بڑھوتری کو روکنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ پہلے کم کم مگر، پھر پورا تن من لگا کر۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر فارم' کانٹینٹ سے مطابقت رکھتا ہو تو وہ اُس کی نشوونما اور پیش قدمی کو تقویت دیتا ہے مگر جوں جوں فارم پرانا ہوتا جاتا ہے تو وہ کانٹینٹ سے مزید مطابقت رکھنے سے معذور ہوتا جاتا ہے۔

اُس کے سجدے طویل ہونے لگتے ہیں، رویے اور لوچ سخت ہونے لگتے ہیں اور چوں کہ یہ خود کو بدلنے سے قاصر ہوتا ہے اس لیے اب وہ کانٹینٹ کی بڑھوتری پہ حسد کرنے لگتا ہے، اسے روکنے کی کوشش کرتا ہے، اسے محدود کرنے کی تگ ودو کرتا ہے، اس کا رقیب بن جاتا ہے۔ تب وہ کانٹینٹ کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتا ہے اور پھر ایک سٹیج پہ جا کر دونوں کے بیچ بقا کی جہد شروع ہو جاتی ہے۔

یہ صرف کرسی کی جنگ نہیں ہے، یہ بقا کی جنگ ہے۔ مضمحل شدہ فارم اور بھرپور متحرک و نشوونما پاتے کانٹینٹ کے درمیان بقا کی جنگ.....اور نتیجے میں بقا کس کی ہوگی؟ بقا' کانٹینٹ کی، نشوونما کی اور ارتقا کی ہوگی۔ کانٹینٹ نشوونما کی بنیاد ہے۔ ارتقا کانٹینٹ کے خمیر میں گندھا ہوا ہوتا ہے۔ فارم بے چارہ تو ہارنے والی جنگ لڑ رہا ہوتا ہے۔

چناں چہ اِس مناقشے میں کاہل، بڈھا اور ''لچک اور اکاموڈیٹ کرنے سے محروم شدہ'' فارم مر جاتا ہے۔ یوں بھرپور نشوونما کرتا کانٹینٹ اپنی نشوونما کی راہ میں اب بنی ہوئی اُس رکاوٹ کو دور کرنے میں کام یاب ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فارم اور کانٹینٹ کا اتحاد اضافی اور عبوری ہوتا ہے۔ دور سے اور بہ ظاہر یک جان و دو قالب نظر آتے اِن دونوں کا یہ اتحاد اِن دونوں کے درمیان تنازعات اور جدوجہد سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔

فارم بہ ذاتِ خود بھی کبھی بھی بنا تبدیلی کے نہیں رہتا۔ فنا کی طرف اس کی تبدیلی جاری رہتی ہے۔ مگر یہ تبدیلی، فارم کو ضائع کر کے پھینک دینے کی طرف یک دم نہیں چل پڑتی۔ یہ تو فارم اور کانٹینٹ کے بیچ تضادات کے بہ تدریج تیز ہوتے رہنے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ مزید برآں کانٹینٹ سے بہ راہِ راست وابستہ ہونے والے بیرونی حالات، فیکٹرز اور کنکشنز بھی فارم کی تبدیلی پہ کچھ اثر ڈالتے ہیں۔

فارم کی آزادی ایک relative آزادی ہوتی ہے۔ آزادی کی یہ اضافیت فارم کے بوڑھے ہوتے جانے سے زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ شروع میں فارم کی سٹیبلٹی ایک ایسا فیکٹر ہے جو کانٹنٹ کی بہ تدریج ڈویلپمنٹ کو یقینی بناتا ہے۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ اب یہ کانٹینٹ کے لیے سٹیبلٹی نہیں رہتا بل کہ اب یہ ایک بوجھ، ایک جنجال اور سرگردانی بنتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ قدیم کے

تحفظ کا رکھوالا بن جاتی ہے۔ قدیم اور قدامت کا رکھوالا بن جاتا ہے۔ کانٹینٹ اور فارم اب ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔

جیسے کہ ذکر ہوا کہ ایک کوالی ٹیٹو حالت سے دوسرے میں عبور کے اندر پرانا فارم یا تو منسوخ ہو جاتا ہے۔ یا وہ اپنی صورت بدل دیتا ہے۔ مگر پرانے فارم کو اُس وقت تک منسوخ نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ خود اُس کے اندر ضروری شرائط اور ایک زیادہ بہتر شدہ فارم کی طرف عبور کے لیے عناصر تیار نہ ہوئے ہوں۔ یعنی فارم کی یہ موت اور اُس کے ''اس اخراج'' کا ایک ڈائلیک ٹیکل پراسیس ہے جس میں پرانے فارم کو مکمل طور پر ضائع کر کے پھینک نہیں دیا جاتا اور نیا فارم بھی یک دم مسلط نہیں ہوتا بل کہ بہ تدریج غالب آتا جاتا ہے۔

کبھی کبھار معاملہ الٹ بھی ہو جاتا ہے۔ فارم اور کانٹینٹ کے قانون کے بالکل برعکس۔ یوں دشمنی کے اس کھیل میں کانٹینٹ کے لیے تباہ ہونے والا خدشہ موجود رہتا ہے۔ پرانے فارم کی ''بربادی'' کا یہ خدوخال پیچھے جانے کی ڈویلپمنٹ کے لیے امکانات بھی پیدا کرتا ہے۔ یہ پرانے فارم کی بحالی کے لیے امکانات بھی پیدا کرتا ہے۔ ہم نے کمیونسٹ سوویت یونین کو دوبارہ کپٹلسٹ روس بنتے دیکھا ہے۔

فارم اور کانٹینٹ والے اس قانون کا اطلاق سماج پہ بھی ہوتا ہے۔ سماج کیا ہے؟ یہ پیداوار اور اس سے جڑے ہوئے طبقاتی رشتوں سے بنتا ہے۔ یہاں پیداوار اور اُس سے جڑے ہوئے طبقاتی رشتے کانٹینٹ ہیں اور سیاست، آرٹ، اور مذہب فارم۔ یہ فارم کسی بھی طرح سست اور غیر فعال نہیں ہوتا۔ ان ہی میں اور ان ہی کے راستے انسانیت کی شعوری زندگی چلتی ہے مگر یہ سب کانٹینٹ کے محتاج ہیں۔

سوشل سائنس میں فیوڈلزم پر بھی فارم اور کانٹینٹ کے اصول کا اطلاق ہوتا ہے۔ اگر آلاتِ پیداوار نامی کانٹینٹ ترقی کرتے جائیں گے تو پیداواری رشتے یعنی فارم ایک جگہ تک تو اُن کی مدد کرتے ہیں۔ پھر فارم اُن کی یہ مدد جاری نہیں رکھ پاتا، رک جاتا ہے اور آخر کار یہ فارم یعنی پیداواری رشتے اپنے کانٹینٹ یعنی پیداواری قوتوں (قوتِ محنت اور آلاتِ پیداوار) کی ترقی میں

رکاوٹ بن جاتے ہیں۔تب آلاتِ پیداوار اور قوتِ محنت ترقی کی اپنی صفت کے ہاتھوں مجبور، اپنی ترقی جاری رکھنے کے لیے فارم ہی کا تختہ الٹ دیتے ہیں۔

بلوچستان میں صدیوں سے فیوڈل نظام قائم ہے اور صدیوں ہی سے بھوتار اور رَاہگ (ہاری) پہ مشتمل پیداواری رشتے (فارم) پیداواری قوتوں یعنی آلاتِ محنت اور قوتِ محنت نامی (کانٹینٹ) کی ترقی کو روکے ہوئے ہیں۔مطلب یہ کہ فارم (فیوڈلزم) کافی عرصے سے کانٹینٹ (آلات اور قوتِ محنت) کی نشوونما کا ساتھ نہیں دے پا رہا۔وہ (فیوڈلزم) بوڑھا ہوتا جا رہا ہے اور بلوچستان میں اپنی نشوونما پاتے ہوئے کانٹینٹ (آلاتِ پیداوار اور قوتِ محنت) کے مزید ارتقا اور نشوونما میں رکاوٹ بن رہا ہے۔کانٹینٹ تو نشوونما کی اپنی خصوصیت ترک نہیں کر سکتا اور نشوونما کے نتیجے میں تو وہ ترقی کرتا جاتا ہے۔اب آلاتِ پیداوار اور قوتِ محنت (یعنی کانٹینٹ) کی ترقی نے تو رکنا نہیں لہٰذا لازمی ہے کہ رکاوٹ یعنی فارم، یعنی فیوڈلزم ٹوٹے۔اس کے بغیر سماجی ترقی ممکن ہی نہیں۔

بلوچستان میں حتماً ایک نئے فارم نے وجود میں آنا ہے جو کانٹینٹ کی نشوونما کا کافی عرصہ تک ساتھ دے۔یعنی فیوڈلزم والی فارم نے ٹوٹنا ہے۔ایک نیا فارم قائم ہوگا جسے کیپٹلزم کہیں گے۔مگر کیپٹلزم کا نیا فارم بھی رفتہ رفتہ بے کار ہوتا جائے گا اور پھر وہ بھی برباد ہو کر نئے فارم کو جگہ دے گا، سوشلزم نامی فارم کو۔

کمیونسٹ پارٹی بھی فارم اور کانٹینٹ کے فارمولا پر چلتی ہے۔پارٹی، اُس کا شعوری لیول اور اُس کا ڈسپلن فارم ہیں۔''انقلابی تقاضے'' اُس کا کانٹینٹ ہیں۔سماج میں دونوں یعنی فارم (پارٹی) اور کانٹینٹ (انقلابی رکوائرمنٹ) ضروری ہیں.....اور انقلابی پارٹی (فارم) خواہ جتنی بھی نعرے بازی کرے، خواہ جتنے اجلے جھنڈے اور بینر لہرائے اور خواہ جتنے میٹھے ترانے گائے مگر ایک بات حتمی ہے۔وہ یہ کہ پارٹی اپنے کانٹینٹ کی خوشنودی کے لیے کام کرتی رہے گی، خود کو اُس کے ساتھ ہی ایڈجسٹ کرتی رہے گی۔یہی اُس کی تقدیر ہے۔پارٹی اول نہیں ہے، اُس کا ڈسپلن اول نہیں ہے، اُس کا شعور اول نہیں ہے۔اول تو ''انقلابی ضرورت'' ہے۔پارٹی پابند ہے کہ اسی ضرورت کی مطابقت میں خود کو بدلتی سنوارتی رہے گی۔

قوم اور قومی سوال

''قومی سوال'' ترقی پذیر کیپٹلسٹ ملکوں کا ایک بہت بڑا معاملہ ہے۔

تاریخ میں قوموں کا معاملہ سب سے سنجیدہ انداز میں انیسویں اور بیسویں صدی میں کھل کر سامنے آیا۔قومیں طبقات سے بہت میں بعد پیدا ہوئیں۔طبقات تو غلامی کے سماج میں پیدا ہو گئے تھے مگر غلام داری کے دور میں قومیں وجود میں نہیں آ چکی تھیں۔قومیں بھی اور قومی معاملہ بھی کیپٹلزم میں ابھر کر سامنے آئے۔

قومیں خود بہ خود نہیں بنتیں۔یہ ایک زبردست ارتقائی پراسیس میں سے گزر کر تشکیل پاتی ہیں۔شروع سے لوگ خون کے رشتوں میں بندھے ہوئے اور گروہ کی صورت رہتے ہوئے، زمانے کے گرم وسرد سے گزرتے رہے جہاں وہ معاشی رشتوں میں بھی بندھے رہے۔پھر کئی خاندان مل کر برادری کی تشکیل کرتے رہے۔ایک طویل پراسیس میں مختلف برادریاں باہم ضم ہوتی رہیں اور ''قبیلہ'' تشکیل دیتی رہیں۔حتیٰ کہ صدیوں کے پراسیس میں یہ سارے قبیلے ایک ایسا بڑا گروہ تشکیل دے گئے جو اب محض خونی رشتوں پہ مبنی نہ تھا بل کہ یہ لوگوں کا ایک ایسا بڑا گروپ تھا جو ایک مشترکہ زبان بولتا تھا، جس کا ایک مشترکہ کلچر بن چکا تھا، جس کے پاس ایک مشترک علاقہ تھا، ایک مشترکہ تاریخ تھی، ایک جیسی نفسیاتی ساخت تھی، اُن کی ایک مشترک مارکیٹ بن گئی۔یوں اس بڑے گروہ میں خود کو الگ قوم کہلانے کا عوامی will پیدا ہوا۔

مشترک مارکیٹ کا ہونا بہت اہم ہے۔ مارکیٹ (تجارت) وہاں کے لوگوں کے درمیان روابط بڑھاتی ہے ۔ باہم مضبوط معاشی رشتے بن جاتے ہیں۔ یہ نئے رشتے دراصل قوم کو پیدا کرتے ہیں۔ ان ہی معاشی رشتوں سے ایک جیسی نفسیات پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے منڈی قوم کے اتحاد و پیوستگی کی ضامن ہوتی ہے۔ معاشی زندگی کا اشتراک ایک قوم کی اہم خصوصیت ہوتا ہے۔

نسل اور قوم میں فرق ہوتا ہے۔ نسل ظاہری باتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ رنگ، بالوں، آنکھ، ناک اور سر کی ساخت کے فرق کو نسلی فرق کہا جاتا ہے اور یہ بہت منحوس فرق رہا ہے۔ یورپی گورے نے اپنی نسل کے علاوہ ساری نسلوں کو کم تر انسان کی حیثیت دی اور ان پہ بہت مظالم کیے۔ انھیں قتل کیا، غلام بنایا اور بدترین حالات میں معدنی کانوں میں مشقت کروائی۔ آج بھی دعوؤں کے برعکس نسل پرستی سفید فام دنیا میں زوردار طریقے سے موجود ہے۔

بہت سارے ممالک یک قومی ممالک نہیں ہیں بل کہ وہاں ایک سے زیادہ قومیں آباد ہیں۔ قومی وابستگی بہت سخت جان اور پاورفل جذبہ ہوتا ہے۔ کثیر قومی ریاست میں بالا دست قوم خواہ عقیدہ کا سہارا لے، رنگ و نسل کا، زبان کا یا کسی آفاقی نظریے کا، ایک قوم کسی دوسری قوم میں ضم نہیں ہوگی۔ ایک کثیر القومی ملک میں خواہ کچھ بھی ہو، ایک مشترکہ قوم والا لفظ غیر سائنسی ہے۔

ایک کثیر القومی کپٹلسٹ ریاست میں ہمیشہ زور آور قوم چھوٹی اقوام کا استحصال کرتی رہتی ہے۔ وہ زور آور قوم خود بری طرح ''بگ نیشن شاؤنزم'' میں مبتلا ہوتی ہے۔ وہ قوم اپنے ہاتھوں پسماندہ کردہ محکوم قوم کو ''ترقی دینے'' کا فریضہ بھی ازخود سنبھالتی ہے۔ خود غاصب اور استحصالی ہوتے ہوئے وہ محکوم قوم کو ''تہذیب سکھانے'' کا مشن سنبھالتا ہے اور اس بہانے مزید لوٹ مار جاری رکھتی ہے۔ وہ بدترین فسطائیت لاگو کرتی ہے۔ جمہوریت، مساوات اور انصاف سب کچھ اُس کے ''وائسرائے'' کی خوشی و خواہش کا نام بن جاتے ہیں۔

بالا دست قوم، محکوم قوم کے اندر اپنے ٹاؤٹ ادیب، ٹاؤٹ پیر، ٹاؤٹ ملا اور ٹاؤٹ سیاست کار بناتی جاتی ہے۔ اسی کی طرف سے نافذ شدہ میڈیا پالیسی نافذ ہوتی ہے، اپنی مرضی کے لوگوں کو انعام و اکرام اور ایوارڈ و سند عطا کیے جاتے ہیں۔ کون غدار ہے، کون محبِّ وطن ہے، کون

اہل ہے کون نا اہل ہے، کیا پالیسیاں بنانی ہیں، کیسے اُن پالیسیوں پر عمل کرنا ہے، سب وائسرائے کے ہاتھ میں۔ بالا دست قوم محکوم اقوام کی زبان، کلچر اور اعتقادات کو حقارت سے دیکھتی ہے۔

ایک کثیر القومی سرمایہ دارانہ ریاست میں ظالم قوم کی سیاست پر وہاں کے رجعت پرست چھائے ہوتے ہیں، ان ہی کے خیالات ہر جگہ حاوی ہوتے ہیں۔ پارلیمنٹ، سکولوں، مندروں، بیرکوں اور سیکڑوں ہزاروں اخباروں میں یہی یورش برپا رہتی ہے کہ اُس حاکم قوم کے علاوہ وہاں رہنے والی ساری محکوم قومیں علیحدگی پسند ہیں اور الگ ہونے کی بابت سوچ رہے ہیں۔ بالا دست قوم کی اس قوم پرستی کا زہر پورے ملک کے سیاسی ماحول کو زہر آلود بنا رہا ہوتا ہے۔ قوموں کے حقِ خود اختیاری بشمول علیحدگی کے حق کو تعلیم نہ کرنے کے معنی ہیں بدترین موقع پرستی کا شکار ہونا اور مزدور طبقے کو ان کی قوم کے رجعت پرست خیالوں کے زہریلے جراثیم کا شکار بنانا۔

مزدوروں کا فرض ہے کہ وہ مظلوم قوموں کے حقوق بشمول حقِ علیحدگی کی حمایت کریں۔ اس بات کے بغیر قوموں کے درمیان اتحاد قائم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ظالم قوم کا جو سوشلسٹ اس قسم کی جدوجہد سے پس و پیش کرتا جاتا ہے۔ تو اُس میں، اس کی نیت میں یا اُس کی انڈرسینڈنگ میں کوئی کمی ہے، کوئی کھوٹ ہے۔ ایسے شخص یا اشخاص کے قومی مسئلے پر خیالات ویسے ہی ہوں گے، جیسے اُن کی قوم کے سرمایہ داروں کے ہیں۔

قومی سوال کو محض زبانی کلامی تسلیم کرنا کافی نہیں ہے۔ ظالم قوم کے جمہوری انسان اگر اس کے لیے عملی جدوجہد نہیں کرتا تو وہ حقیقت میں مزدور کاز کا خدمت گار نہیں ہے۔ مظلوم قوم کے حقِ خود امتیازی مع علیحدگی کے حق سے انکار کرنے کا مطلب ہے ظالم قوم کی حد سے زیادہ رجعت پرستوں والی قوم پرستی کے ہاتھوں میں کھلونا بن جانا۔

قوموں کے حقوق کو رد کرنے کے معنی ہوں گے کہ طاقت ور اور بالا دست قوم جو خاص مراعات ہڑپ کر کے بیٹھی ہے اور پولیس راج کے انتظامی طریقے استعمال کرتی ہے ان کا دفاع اور وکالت کرنا۔ بڑی قوم کے جمہوری انسان کو بہ ہر صورت 1920ء میں منعقد شدہ تیسری انٹرنیشنل کی کانگریس کے منظور کردہ اس نعرے کو اپنانا ہوگا: دنیا کے مزدور اور دنیا کی مظلوم قومیں متحد ہو کر ایک ہو جاؤ!

اسی طرح جو لوگ قومی حقوق کے نام پر پرولتاری بین الاقومیت کو پاؤں تلے روندتے ہیں، وہ دنیا کے تنگ نظر ترین لوگ ہوتے ہیں۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ پرولتاری بین الاقوامیت اور قومی مفادات میں مناسبت لازم ہے۔ حقیقی وطن دوستی بین الاقوامی پہلو رکھتی ہے اور بین الاقوامیت پسند لوگ سخت وطن دوست ہوتے ہیں۔ مزدور پارٹی کی قومی اور بین الاقوامی ذمہ داریاں ایک دوسرے کے ساتھ جدا نہ ہونے والی ہیں اور مزدور پارٹی جس طرح اپنے ملک کے مزدوروں اور عوام کو جواب دہ ہے، اسی طرح وہ یہ عالمی مزدور طبقے کو بھی جواب دہ ہے۔ مارکسسٹ لیننسٹ اگر تنگ نظر قوم پرستی کے بھی خلاف ہیں تو وہ اتنی ہی شدت کے ساتھ طاقت ور قوم کی طرف سے دوسری قوموں پر تسلط پسندی کو بھی مسترد کرتے ہیں۔

دور کیوں جایئے، خود اپنی تاریخ دیکھیے۔ یہاں بالادست قوم کے حاکم طبقات کی طرف سے قومی یک جہتی پہ نام سے سارے وسائل کا دھارا اپنی طرف موڑتے ہوئے چھوٹی اقوام کو محض طفل تسلیاں دی جاتی ہیں۔ بدترین قسم کا ون یونٹ قائم کیا جاتا ہے۔ چھوٹی اقوام کی تاریخ مسخ کی جاتی ہے، اُس کے ہیروؤں کی تعظیم کے الٹ اقدام کیے جاتے ہیں اور بدترین سنسر شپ نافذ کی جاتی ہے۔

یہی زور آور قوم محکوم قوم کے اندر سے اپنے سہولت کاروں میں سے اسمبلی ممبروں، کابینہ اور چیف منسٹر، گورنر اور سپیکر کو سلیکٹ کرتی ہے۔

حاکم قوم کی لوٹ مار کے ساتھ ساتھ محکوم کو ایک اور بلا کا بھی سامنا ہے۔ وہ ہے: اس کا اپنا سردار، وڈیرہ، جاگیردار، ملّا، میر اور پیر۔ یہ طبقہ بیرونی ظالم قوم سے بچی کھچی ''دولت'' اپنی قوم سے چھین لیتا ہے لہٰذا ہر محکوم قوم کے انقلابی کو بہ یک وقت دو طاقتوں کے خلاف جدوجہد کرنی ہوتی ہے: بیرونی قوم کے استحصال کے خلاف، اور اپنی قوم کے بالائی طبقے کے خلاف۔ ان دونوں دشمنوں میں نمبر 1 اور نمبر 2 نہیں ہوتے۔ دونوں کے خلاف یکساں جوش و ہوش کے ساتھ جدوجہد کرنا۔

محکوم قوم کا بورژوازی اور اُس کا ٹاؤٹ دانش ور جو چاہے کہے مگر حقیقت یہ ہے کہ آزادی کا ایک نہیں دو مطلب ہیں: ظالم قوم سے آزادی بھی اور اپنے فیوڈلزم سے آزادی بھی۔ مگر محکوم قوم

کی بورژوازی اور پیٹی بورژوازی فیوڈلزم کا خاتمہ نہیں چاہتی۔ وہ لوگوں کو صرف بڑی قوم سے نجات پہ اکساتی ہے۔ جب کہ اصل کام تو حاکم قوم سے اپنے قومی حقوق کے لیے سخت جدوجہد بھی کرنا ہے اور ساتھ میں فیوڈلزم کا خاتمہ بھی کرنا ہے۔

یاد رکھنے کی بات ہے کہ محکوم اقوام کے اندر ہر نیشنلسٹ کمیونسٹ نہیں ہوتا مگر وہاں ہر کمیونسٹ کے لیے (شاؤنزم کی ہر شکل سے پاک) نیشنلسٹ ہونا لازمی ہے۔ کمیونسٹ بغیر شرائط، بغیر اگر مگر اور بغیر حیل و حجت کے قوموں کے حقِ خود اختیاری بشمول حقِ علیحدگی کی حمایت کرتا ہے۔ کمیونسٹ قومی سوال کو انقلابی تحریک کے اندر طبقاتی سوال کے جڑواں حیثیت میں بنیادی معاملہ گردانتا ہے۔ وہ ہمیشہ اسے ورکنگ کلاس معاملے کے ساتھ ملا کر رکھتا ہے، اسے بین الاقوامی مزدور تحریک اور سماجی ترقی کی جدوجہد کے ساتھ ملا کر رکھتا ہے۔ وہ یہ تو سمجھتا ہے کہ قومی مسئلے کا کپٹلزم کے اندر رہ کر کوئی حل موجود ہی نہیں ہے۔ مگر وہ اس بات سے متفق نہیں ہوتا کہ جب تک سوشلزم نہ آئے تب تک قومی سوال کو ملتوی رکھا جائے۔ چناں چہ پس ماندہ معاشروں میں مجرد طبقاتی سوال یا مجرد قومی سوال نہیں ہوتا۔ یہ دونوں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ انھیں علیحدہ کرنا خیانت ہے۔

کمیونسٹ قومی مساوات اور سیاسی آزادی کا سب سے زیادہ پُر جوش علم بردار ہوتا ہے۔ وہ سماجی ترقی میں رکاوٹ ڈالنے والی رجعت پرست قوتوں کے خلاف لڑتا ہے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ بورژوا قومی آزادی تحریک نہ تو پرولتاری ہوتی ہے اور نہ سوشلسٹ۔ نہ اس کا مقصد کپٹلزم کا خاتمہ اور سوشلزم کا قیام ہے۔ چناں چہ اس تحریک کی اہمیت میں مبالغہ آرائی نہ ہو اور نہ اسے اصل انقلابی قوت سمجھا جائے۔ لیکن وہ خود اپنے پروگرام میں قوموں کے حقِ خود اختیاری کو لازمی نکتے کے بہ طور شامل رکھتا ہے۔ کمیونسٹ قومی سوال کا مالک ہوتا ہے، محض حامی نہیں ہوتا۔ اسے ہی لیڈ کرنا ہوتا ہے اس تضاد کو۔ وہ کسی اور کو قومی مسئلے کا سجادہ نشین، ایجنسی ہولڈر اور مالک سمجھتا ہی نہیں۔

ریاست

سٹیٹ ،اتھارٹی کی ایک تنظیم ہے ۔ یہ سماج کی طبقاتی تقسیم سے وابستہ ہے ۔سٹیٹ معاشی طور پر حاوی طبقے کی سیاسی تنظیم ہے ۔ یہ اُس طبقے کے ہاتھ میں جبر کا ،ڈنڈے کا ،جیل و پھانسی کا ایک آلہ ہوتا ہے جس کو یہ طبقہ محکوم طبقے کے خلاف استعمال کرتا ہے ۔ اس میں فوج ، پولیس، عدالتیں ،جیلیں میڈیا سب شامل ہوتی ہیں ۔

ہر ریاست نظریاتی ریاست ہوتی ہے ۔ یہ ریاستی نظریہ کبھی سیاسی ہوتا ہے ،کبھی اقتصادی اور کبھی مذہبی ۔اس کے ذریعے ریاست کے باشندوں کو اطاعت کا ''خوگر'' بنایا جاتا ہے ۔ان کے دل و دماغ کو ریاست کے اغراض و مقاصد کے مطابق ڈھالا جاتا ہے اور یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ ان کا اور ریاست کا مفاد مشترک ہے ، حالاں کہ حقیقت میں ریاست ایک طبقاتی ادارہ ہے ،جس کا بنیادی مقصد برسر اقتدار طبقے کے مفادات کا تحفظ ہوتا ہے ۔

مطلب یہ ہے کہ ریاست حکم رانوں کے طبقے کے ہاتھ کا ہتھیار ہے جس سے وہ غیر حکم ران طبقات کو زیر کرتا ہے ۔ریاست سرداروں ، خانوں ، جاگیرداروں ،سرمایہ داروں اور اِن سب کے مرشد (امریکا) کے مفادات کی چوکیدار ہوتی ہے ۔ریاست کے ستون یعنی عدالت ،فوج ،اسمبلی اور میڈیا ان ہی طبقات کی خدمت گزاری کرتے ہیں ۔

اس ریاست کی صورت کہیں بادشاہت والی ہوتی ہے ،کہیں مارشل لا والی اور کہیں وہ جمہوری ریاست کی صورت میں ہوتی ہے ۔

سٹیٹ سماج کی اپنی پیداوار ہے ۔ یہ باہر سے مسلط نہیں ہوتی ۔ یہ کھمبی کی طرح اچانک بھی زمین سے نہیں اگتی ۔ یہ تو سماجی ارتقا کی ایک خاص منزل پہ پیدا ہو جاتی ہے ۔ یہ ایک مسلسل تاریخ رکھتی ہے ۔ یہ شروع سے موجود نہ تھی اور نہ یہ ہمیشہ قائم رہے گی ۔ موجود نہ تھی ، اس لیے کہ پرانے زمانوں میں خونی رشتوں پہ مشتمل سماج ہوا کرتا تھا ۔زبان و عقیدہ اور اُٹھک بیٹھک ایک جیسی ہوا کرتی تھی ۔ انسان بستیاں بسانے سے قبل کسی علاقے یا سرحد تک محدود نہ تھا ۔ بارشوں کا پیچھا کرتے ہوئے یا شدید موسموں کے عذاب سے بچنے کے لیے کبھی یہاں کبھی وہاں پڑاؤ ڈالا جاتا تھا ۔ وہاں خونی رشتوں کی یہ آبادی طبقات میں بٹی ہوئی نہ تھی ۔ اِسی لیے حاکم محکوم والا معاملہ نہ تھا ۔اسی لیے پولیس و جیل موجود نہ تھا ۔

جوں جوں سماج ترقی کرتا گیا ،طبقات وجود میں آ گئے ۔کوئی امیر بنتا بنتا بالادست بن گیا اور بقیہ آبادی درجے میں گرتی گئی ۔ بالادست زمین ، چراگاہ ، پانی اور مویشی پہ قابض ہوتا گیا اور بقیہ آبادی ان سب سے محروم ہوتی گئی ۔ مطلب یہ کہ جب سردار ، خان ، جاگیردار موجود نہ تھے تو ریاست تھی ہی نہیں ۔ ریاست اُس وقت پیدا ہوئی جب انسان اپنی ضرورت سے زیادہ پیداوار کرنے لگا ۔تب زور آور اور مکار شخص نے پیداوار کے سرچشمے کو ہتھیا لیا ۔اسے برقرار رکھنے کے لیے اسے گارڈ کی ضرورت پڑی ۔یعنی اب بالادست یا امیر یا جائیداد و ملکیت والے طبقے کو اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے طاقت کی ضرورت پڑی ۔ تب پولیس یا لیویز وجود میں آئی ۔ اپنی جائیداد کی حفاظت کے لیے باغی کو جیل میں بند کرنے کے لیے جیل خانے بنانے پڑے ۔اپنے حق میں فتوے دینے کے لیے اس نے پنڈت پادری کے ادارے ایجاد کیے ۔شاعر سے اپنے حق میں گیت کہلوائے اور اپنے لیے فیصلے لینے کے لیے کرایہ دے کر طرف دار جرگہ یعنی عدلیہ تشکیل دی اور ایک ایک کر کے دوسرے ادارے بنانے پڑے ۔ اِن سب ناجائز اداروں کے مجموعے کو ''سٹیٹ'' کہا جاتا ہے ۔ یوں پراسراریت میں لپٹی ہوئی ، ایک دیوتا نما سردار اور بادشاہ کی سٹیٹ چل پڑی ۔

دوسرے لفظوں میں ،سٹیٹ طبقات کی پیداوار ہے ۔اس کا کام ہی یہ ہے کہ یہ حاکم طبقہ کی بالادستی کو قائم و دائم اور بچائے رکھے ۔حکم ران طبقہ خواہ بادشاہ ہو ،تھیوکریسی ہو ، جاگیردار ہو، کیپٹلسٹ ہو یا سوشلسٹ ، سٹیٹ اُس کی خدمت کرے گی : یعنی حکم ران طبقہ کی خدمت ۔سٹیٹ

طبقاتی اداروں کا کُل ہوتی ہے۔ سٹیٹ طبقاتی ہوتی ہے۔

سٹیٹ اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ سماج خود اپنے ناقابلِ حل تضاد میں پھنس گیا ہے۔ جسے وہ خود دور نہیں کر سکتا یعنی طبقات میں مصالحت ممکن نہیں رہتی تب ریاست پیدا ہوتی ہے۔

ریاست سارے سماج کی مستند نمائندہ تھی۔ یہ ایک مجموعہ کی شکل میں اس کا ''نظر آنے والا'' اظہار تھی۔ لیکن اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ ریاست اس طبقے کی تھی جو اُس عہد میں سارے سماج کی نمائندگی کر رہا تھا۔ عہدِ قدیم میں ریاست غلاموں کے مالکوں کی تھی۔ سرداری نظام میں ریاست سرداری ہوتی ہے، جاگیرداری میں بادشاہت اور کیپٹلزم میں ری پبلک۔

سماج ارتقا کرتا گیا تو ریاست بھی جدید بنتی گئی۔ مگر اُس کی بنیادی ڈیوٹی نہیں بدلی۔ آج جدید کیپٹلزم میں عام جرگہ کی جگہ فل فلیجڈ جوڈیشری سامنے آئی۔ ایک ڈھیلے ڈھالے قبائلی لشکر کی جگہ سٹینڈنگ آرمی کھڑی کر دی گئی۔ پارلیمنٹ بنی۔ اخبار اور ریڈیو سے بڑھتے بڑھتے میڈیا نے ٹی وی چینل اور سوشل میڈیا کی صورت ارتقا کیا اور یہ سب (یعنی ریاست) کیپٹلزم کی خدمت گزاری کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اب پارلیمنٹ سرمایہ داروں کی حکومت کی مالک نہیں ہے بل کہ اس کے برعکس حکومت پارلیمنٹ کی مالک اور آقا ہے۔ دراصل اگر فاشزم بورژوازی کی ٹیررسٹی ڈکٹیٹرشپ ہے تو پارلیمانی ڈیموکریسی اس کی بھیس بدلی ڈکٹیٹرشپ ہے۔

ریاست کی طرف سے کیپٹلزم کی اِس خدمت گزاری کا مطلب ہے: مخالف طبقات یعنی کسانوں مزدوروں اور دانش روں کو دبانا اور اُن کی تحریک کو کچلنا۔

آج کی ماڈرن ریاست منا پولیز کے مفاد میں معیشت کو کنٹرول اور ریگولیٹ کرتی ہے۔ اس طرح کر کے ریاست نہ صرف منا پولیز کو یہ موقع دیتی ہے کہ وہ خود اپنے سرمایہ (کیپٹل) کو اپنے فائدے کے لیے موڑ دیں بل کہ وہ انھیں ریاستی خزانے کو بھی استعمال کرنے کا موقع دیتی ہے جو کہ آبادی پر ٹیکس لگا لگا کر بھرتا جاتا ہے۔ گویا ماڈرن ریاست سُو پر منافعوں کو پمپ کرنے کی ایک مشین ہے۔

ریاست ہر چیز کو سرمایہ داروں اور اشرافیہ کی نظر سے دیکھتی ہے، وہ ان ہی پر عنایتیں برساتی ہے اور انھیں ہی سارے حقوق عطا کرتی ہے۔ وہ ملک کا انتظام اُن کے حوالے رکھتی ہے اور

اُن مزدوروں کو فسادی قرار دیتی ہے جو اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ سٹیٹ یہ بیان کرتی ہے کہ وہ فیکٹری مالکان اور مزدور دونوں کی بہبود کو مساوی طور پر اپنے دل کے قریب رکھتی ہے مگر اندھے کو بھی پتہ ہوتا ہے کہ وہ خالی خولی الفاظ ہیں۔

اس لیے ریاست عام آدمی کے لیے ماں نہیں ہوتی۔ یہ صرف اور صرف بالائی طبقات کے لیے ماں ہوتی ہے۔ عوام کے لیے، نچلے محکوم طبقہ کے لیے تو یہ ڈائن ہوتی ہے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ ریاست اور قوم کی سرحدیں ایک ہوں۔ مثلاً جرمن قوم دیر تک دو آزاد ریاستوں میں بٹی رہی۔ یہی حال ویت نام کا رہا۔

ریاست کے حدود اربع گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ مثلاً آج ہندوستان کی سرحدیں وہ نہیں جو 1947ء سے پہلے تھیں۔ پاکستان کی سرحدیں آج وہ نہیں ہیں جو 14 اگست 1947ء کو تھیں۔ مگر سرحدوں کے برعکس قوموں اور تہذیبوں کی حدود بہت مشکل سے بدلتی ہیں۔

بعض ریاستوں میں ایک ہی قوم آباد ہوتی ہے۔ جیسے جاپان میں جاپانی قوم، اٹلی میں اٹالین قوم اور فرانس میں فرنچ قوم۔ ایسی ریاستوں کو قومی ریاست کہا جاتا ہے۔ لیکن بعض ریاستوں میں ایک سے زیادہ قومیں آباد ہوتی ہیں جیسے کینیڈا میں برطانوی اور فرانسیسی قومیتیں۔ پاکستان میں بلوچ، پشتون، سندھی، پنجابی وغیرہ قومیں۔

جدید ریاست ایک افسر شاہانہ درندہ ہے جو محنت کش طبقے کی پیدا کردہ دولت کے بہت بڑے حصے کو ہڑپ کر جاتی ہے۔ سٹیٹ' استحصال کا ایک ناترس آلہ ہے۔

محنت کش اس جدوجہد میں ہوتے ہیں کہ ریاست کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ مقصد نجی ملکیت کا خاتمہ کرنا ہوتا ہے۔ محنت کش بورژوازی کو نکال کر اپنا سیاسی اقتدار قائم کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔

انارکسٹ کہتے ہیں کہ سٹیٹ کو کچھ نہ کہا جائے کیوں کہ یہ ایک فضول ایجاد اور بے کار آلہ ہے۔ ہمارا اِس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایک ناپاک شئے ہے اس لیے اسے ہاتھ نہ لگایا جائے۔ بورژوازی کہتی ہے یہ مقدس ہے اس لیے اسے ہاتھ نہ لگایا جائے۔ دونوں کہتے ہیں کہ اسے نہ چھوا جائے۔

مگر انقلابی کہتے ہیں کہ اُس کو نہ صرف چھوا جائے بل کہ اسے اپنے ہاتھوں میں لیا جائے، اس پہ قبضہ کیا جائے۔ اسے اپنے طبقاتی مفادات کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے تا کہ نجی ملکیت کا خاتمہ کیا جا سکے اور محنت کش طبقہ اپنی نجات کرے۔

محنت کشوں کا سیاسی اقتدار، موجودہ بورژوا ریاست کے برعکس ایک زیادہ جمہوری سٹیٹ قائم کرتا ہے:

1۔ واپس بلائے جانے کا حق عوام کو دے کر تمام افسروں کو آزادانہ انتخابات کے ذریعے منتخب کیا جائے۔

2۔ ایک ہنرمند مزدور سے کسی بھی افسر کی اجرت زیادہ نہ ہو۔

3۔ مسلح عوامی ملیشیا فوج کی جگہ لے لے۔

اس لیے پرولتاریہ کی سٹیٹ دراصل سٹیٹ نہیں ہوتی بل کہ نیم سٹیٹ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بورژوا سٹیٹ تو عوام سے خود کو بے گانہ کرتی جاتی ہے، عوام کی مخالفت کرتی ہے اور عوام کو بالادست طبقہ کے نیچے رکھتی ہے مگر پرولتاریہ والی سٹیٹ حتمی طور پر عوام کے مفادات کا اظہار کرتی ہے۔ یہ نیم ریاست ہوتی ہے۔ یہ ریاست مستقبل میں کمیونسٹ ری پبلک (خودانتظامیہ) کے لیے جگہ خالی کرتی جائے گی۔ حتیٰ کہ یہ بہ طورِ ریاست اپنا وجود کھو دے گی۔

یعنی آخر کار جب ریاست سچ مچ پورے سماج کی نمائندہ بنتی ہے تو اُس وقت اُس کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ کوئی ایسا طبقہ ہی باقی نہیں رہتا، جس کو محکوم بنا کر رکھا جائے۔ طبقاتی تسلط اور انفرادی زندگی کی بقا کی جدوجہد جو پیداوار کی طوائف الملو کی پر مبنی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ اس کے بطن سے پیدا ہونے والے جھگڑے اور تصادم اور زیادتیاں سب ختم ہو جاتی ہیں۔ کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہتی جس پر جبر کیا جائے اور اس لیے ریاست بہ طور جبری قوت آخری کام یہ کرتی ہے کہ سماج کے نام پر تمام ذرائع پیداوار پر قبضہ کرتی ہے۔ ریاست کی حیثیت سے یہی اس کی آخری خدمت ہے۔

اب سماجی تعلقات میں ریاست کی مداخلت غیر ضروری ہوتی ہے اور بالآخر یہ ختم ہو جاتی ہے۔ البتہ، ریاست کا یکا یک 'خاتمہ'' نہیں ہوتا اس کا پودا رفتہ رفتہ خود سوکھتا جاتا ہے۔

مزدور طبقہ ریاست سے جتنے دن بھی کام لیتا ہے، وہ آزادی کی خاطر نہیں بل کہ اپنے دشمنوں کا سر کچلنے کا کام ہوتا ہے اور جون ہی آزادی کا امکان پیدا ہو جاتا ہے، ریاست کی حیثیت سے ریاست کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

یہ زمانہ ترقی یافتہ کمیونزم کا ہوگا۔ وہاں ریاست صرف اس وقت بکھر جانے کے قابل ہوتی ہے جب عوام الناس بنیادی اصولوں پر چلنے کے عادی ہو جائیں اور وہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق کام کر رہے ہوں اور پیداوار کی تقسیم اُن کی ضرورتوں کے مطابق ہو رہی ہو۔

علم اور عمل کا نظریہ

قانونِ فطرت پر یقین رکھنے کا مطلب کائنات کے قابلِ ادراک ہونے پر یقین رکھنا ہے۔

کائنات کی تاریخ میں چار پانچ واقعات انتہائی اہم تھے۔ اُن واقعات نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا۔

اول: بہ ظاہر بے جان مَیٹر کے ارتقا میں جان دار تک آ جانا ایک معراج تھی۔

دو: اور پھر جان داروں کے ارتقا کی آخری اور قطعی جہت انسان کا وجود میں آ جانا۔

تین: انسان کا دو پاؤں پر کھڑا ہونا اور ہاتھوں کا آزاد ہو جانا ایک اور ترقی تھی۔

چار: اور پھر دونوں ہاتھوں کا عجیب ترین ہونا تو کمال کا ارتقا تھا۔ ان ہی ہاتھوں کی انگلیوں کی فن کاری نے پھر دماغ کو ماہر اور استاد بنا لیا۔ ہاتھ کی انگلیوں کی پیچیدہ ترین صلاحیتوں، ہاتھ کے پنجے کی موومنٹ کی بہت طرفہ سمتیں اور کہنی اور کندھے سے بازو کی ہمہ سمت مڑ سکنے کی صلاحیت نے انسانی دماغ کو بہت کچھ دیا۔ آج بھی اگر انسان کے ہاتھوں کی صلاحیتیں بکری کی اگلی ٹانگوں جیسی ہو جائیں تو دس دماغ بھی اکٹھا کر لیں تب بھی انسان انسانیت کا عروج تو کیا اپنا منہ تک نہ دھو سکے۔

پانچ: انسان میں دماغ کے مرحلے تک پہنچنا، بلندیوں کی بھی بلندی تھی۔

دوسری بات یہ بھی طے ہو چکی ہے کہ مَیٹر بنیادی ہے اور شعور سے آزادانہ اپنا وجود رکھتا

ہے۔ ازل سے موجود مَیٹر سے ہی چند لاکھ برس قبل انسان اور دوسرے جان داروں اور مظاہر کا وجود ہوا۔ پہاڑ دریا اور دشت انسان سے ملینوں سال پہلے سے موجود رہے، انسان تو بہت بعد میں آیا۔

کاسموس کی عمر 14 بلین سال ہے۔ جب کہ زمین کی عمر 4.6 بلین سال ہے۔ کائنات میں زندگی نے تو بہت دیر بعد جنم لیا ہے اور انسان، وہ تو بہت بعد میں آیا۔ انسان محض سات ملین سال کا ہے اور اس کے اندر کا برین تو بہت عرصہ بعد ڈویلپ ہوا۔ (یعنی کاسموس) انسان سے کم از کم تیرہ بلین سال پہلے سے موجود تھی اور زمین ہم سے چار بلین سال سینئر ہے۔ یوں مَیٹر انسان اور اُس کے ذہن کا باپ ہے اور انسانی ذہن مَیٹر کا بیٹا۔ بیٹا تو والد سے بڑا نہیں ہوتا ناں! لہٰذا ہم اور ہمارا شعور مَیٹر سے بہت بعد میں آئے ہیں۔

شعور (Consciousness) اپنی ذات اور اپنے اردگرد موجود دنیا کے بارے میں جاننے کو کہتے ہیں۔ مغز اور وہاں پیدا شدہ شعور اِسی مَیٹر ہی سے ڈویلپ ہوئے۔ اسی پہلے سے موجود مَیٹر سے انسان بنا اور اسی پہلے سے موجود مَیٹر سے انسانی برین بنا۔ جو غور فکر کرنے کی ایک مہان فیکٹری ہے۔

شعور صرف اور صرف انسانی برین کا کام ہے۔ کائنات میں کسی اور چیز میں یہ اہلیت نہیں ہے۔ حتیٰ کہ انسان کے اندر بھی دماغ کے علاوہ کسی اور عضو میں یا کسی اور سیل میں شعور نہیں ہے۔ منصوبہ، نصب العین، مقصد سب انسانی برین کے کام ہیں۔ گدھے کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔ چلتن پہاڑ کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔ بیجی اور ہنگول کے مقدس دریاؤں کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔ سمندر کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔ نصب العین، مقصد اور نظریہ صرف انسان کا ہوتا ہے اور انسان محض سات ملین سال سے اِس 14 بلین برس بوڑھے کائنات میں آیا ہے۔ اس لیے شعور، منصوبہ، نصب العین بھی انسانی برین کے ڈویلپ ہونے کے بھی بعد آئے۔ یوں مَیٹر یعنی برین شعور کو بناتا ہے نہ کہ شعور سے مَیٹر بنتا ہے۔ شعور اور آئیڈیا مَیٹر ہی سے وجود میں آتے ہیں۔

چوں کہ مغز میں سے آئیڈیا اور شعور نکلتے ہیں تو اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ شعور اور آئیڈیاز بھی مَیٹر ہیں، آواز و صدا بھی۔ ارے بھئی عشق و محبت بھی مَیٹر ہیں۔ جس چیز کو ہم خیال یا

روح کہتے ہیں وہ دراصل انسان کے مغز ہی کا عمل ہے۔ مغز سے باہر اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔

شعور کے نمودار ہونے کے بعد انسانوں اور جانوروں کے درمیان فیصلہ کن فرق پیدا ہوگیا۔

*****

آپ سمجھیے کہ ہم ایک نوزائیدہ بچے کے مغز پہ بات کر رہے ہیں۔ مغز ایک زبردست آرگن ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ شروع شروع میں کورا کاغذ ہے۔ یہ استعمال سے نشوونما پاتا ہے۔ بچہ شروع دن ہی سے آس پاس کی دنیا سے interact کرتا ہے، مشاہدہ کرتا ہے اور چیزوں پہ کام کرتا ہے۔ پیدائش کے وقت اس کا محض برین سٹیم اور سپائنل کارڈ ڈویلپ شدہ ہوتا ہے۔ جس سے وہ محض، سونا، کِلنگ ،rooting اور فیڈنگ کرسکتا ہے۔ اس مغز میں دوسرا کوئی پروگرام فیڈ نہیں ہے۔ اس نوزائیدہ کے شعور تک پہنچنے کے پراسیس میں مندرجہ ذیل اعضا اور اقدامات آتے ہیں:

1۔ حواسِ خمسہ

ہم یہ تو جانتے ہیں کہ بچہ اس دنیا میں عظیم ترین learning مشین ہے۔ سوال یہ ہے کہ نوزائیدہ بچے کا کورا کاغذ یعنی مغز یا ہارڈ ڈسک پروگرامڈ کیسے ہوتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس کے جسم میں بالخصوص انگلیوں بھرے دو ہاتھ، دو کان، دو آنکھیں، دو نتھنے اور جسم کا سب سے وسیع وعریض عضو یعنی جلد موجود ہوتے ہیں۔ جو کہ ہمہ وقت اور ہمہ حالتِ حیرانی کے ساتھ سرگرم طور پر بیرونی دنیا کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔

یہ اعضا اپنے اپنے مشاہدات مغز کے خالی مگر بہت بڑے ہارڈ ڈسک میں ڈالتے جاتے ہیں۔ یعنی درد، جلن، ٹھنڈک، گرمائش، نرمی سختی، خوشبو بدبو اور آنکھ سے دیکھی ساری چیزیں ہارڈ ڈسک میں بھرتی ہوجاتی ہیں۔ اِن مشاہدات کو ہم ''حسیاتی علم'' یا(Perceptual knowledge) کا نام دیتے ہیں۔ یعنی وہ علم جو senses یا حواس سے percieve کیا جاتا ہے۔ یہ کام اشیا کو جاننے یعنی علم کی پہلی سطح ہے۔

آپ تصور کریں کہ اگر جلد، ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک اور کان موجود نہ ہوں یا فنکشن نہ کریں تو مغز کی ہارڈ ڈسک تو خالی رہے گی۔ اس صورت میں اسے مغز تو نہیں کہا جاسکتا۔ چناں چہ مغز اکیلا کچھ نہیں۔ وہ اپنے ساتھ ایسے آلات رکھتا ہے جو بیرونی دنیا کی معلومات اُس تک پہنچاتے ہیں۔ یہ آلات ہمارے حواس ہیں۔ مغز، حسیات کے دریچوں سے دیکھنے پر مجبور ہے۔

جو شخص اپنی آنکھیں بند کرے، اپنے کان میں پنبہ ٹھونس دے اور خود کو معروضی دنیا سے مکمل طور پر کاٹ دے تو اس کے پاس علم نام کی کوئی چیز نہ ہوگی۔ علم تو تجربے (عمل) سے شروع ہوتا ہے۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ یہ اعضا رکتے نہیں، آرام نہیں کرتے بل کہ ساری عمر اپنے حاکم یعنی برین کو پیغامات بھیجتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر یہ سارے اعضا موجود ہوں مگر حرکت نہ کریں تب بھی کوئی سگنل برین کے ہارڈ ڈسک کی طرف نہیں جائے گا۔

لہٰذا سارا علم انسان کے سینس آرگنز کے ذریعے معروضی بیرونی دنیا کے احساس سے شروع ہوتا ہے۔

لیکن اگر ہارڈ ڈسک کو فیڈ کرنے کے بعد برین کے یہ اہل کار اعضا، بے کار ہوجائیں تب بھی برین کام نہیں کرتا۔ وجہ یہ ہے کہ برین کو چیزوں کو پراسیس کرنے کے لیے نئی نئی انفارمیشن کی ضرورت ہوتی ہے۔ نئی حسیاتی انفارمیشن یا چیلنج یا ٹاسک نہ ملے تو ہارڈ ڈسک میں سٹور پروگرام بے کار پڑا رہتا ہے۔ کسی چیز کو جاننے کے لیے اس کے ساتھ رابطے میں رہنا ضروری ہے، اس کو پریکٹس کرنا ضروری ہے۔ کچے خربوزے کا ذائقہ جاننے کے لیے کچے خربوزے کا چکھنا ضروری ہوتا ہے۔ مگر پکے خربوزے کا ذائقہ جاننے کے لیے کچے خربوز کے ذائقہ کا علم کام نہیں دے گا۔ اس کے لیے آپ کو پکے خربوزے کا ذائقہ چکھنا ہوگا۔ فیوڈلزم کے اندر رہتے ہوئے آپ فیوڈلزم ہی کے قوانین کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ مگر اُس فیوڈلزم کے اندر رہتے ہوئے ایڈوانس میں کپٹلسٹ سماج کے قوانین جاننا ناممکن ہے۔ مارکس کے زمانے میں امپیریلزم یعنی سام راج نہ تھا۔ اس لیے وہ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ لینن کے زمانے میں ظہور پذیر ہوا، اس لیے لینن ہی نے

امپیریلزم کے قوانین جانے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ علم کو زیادہ گہرا ہوتے رہنا چاہیے ۔ یعنی علم کے ادراکی Perceptual مرحلے کو استدلالی Rational علم تک بڑھوتری کرتے رہنا چاہیے۔

ایک چیز پہ اس کی مجموعیت میں غور کرنے، اس کے جوہر (essence) پہ غور کرنے، اس کے موروثی قوانین کو پہ غور کرنے کے لیے، احساسِ ادراک (Sense of Perception) کے امیر اعداد و شمار کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کے لیے ایکسر سائز کے ذریعے، کچرا کو ضائع کرنے اور لازم کو چننے کے لیے ، باطل کو ختم کرنے اور سچ کو برقرار رکھنے کے لیے، ادراکی (Percetional) سے استدلالی (Rational) علم کی طرف ایک چھلانگ لگانا لازم ہے۔

لہٰذا علم کے پراسیس میں پہلا قدم بیرونی دنیا کی چیزوں سے ڈائریکٹ رابطہ رکھنا ہے۔ یہ درک اور ادراک یعنی Perception کا مرحلہ ہوتا ہے۔ دوسرا قدم اِس ادراک (Perception) کے ڈیٹا کو ترتیب دے کر اور دوبارہ کنسٹرکٹ کر کے SYNTHESIZE کرنا ہے۔

استدلالی (Rational) علم، ادراکی (Perceptual) علم پر انحصار کرتا ہے اور ادراکی (Perceptual) علم کو استدلالی (Retional) میں ترقی کرنا ہے۔

2۔ بھیجا، دماغ یا مغز (برین)

اب آجایئے برین یعنی مغز کی طرف۔ برین (مغز) پورے جسم کے وزن کا محض دو فی صد ہے مگر یہ جسم کے کُل آکسیجن کا 20 فیصد خرچ کرتا ہے اور شیر خوار بچوں میں تو یہ شرح 50 فیصد تک ہوتی ہے۔ دوسرا کمال دیکھیے کہ جسم کے گلوکوز کا 20 فیصد صرف مغز استعمال کرتا ہے۔

موٹے الفاظ میں برین شعور، تصورات اور خیالات سے متعلق آلہ ہے۔

برین کے کام درجِ ذیل ہیں:

1۔ انفارمیشن جمع کرنا تو اُس کا سب سے اہم کام ہے۔

2۔ دوسرا بڑا کام حسیاتی آرگنز سے آمدہ انفارمیشن کو سٹور کرتے رہنے کا ہے۔

3۔ پھر تیسرا کام وہ یہ کرتا ہے کہ اس ساری انفارمیشن کی فائلیں بناتا جاتا ہے۔ فولڈرز بناتا جاتا ہے اور انھیں ترتیب دیتا ہے۔

4۔ صرف یہ نہیں بل کہ چوتھا کام وہ یہ کرتا ہے کہ ضرورت کے وقت اِن فائلوں، فولڈروں کو فوری کھولنے کا پکا انتظام کرتا رہتا ہے۔

5۔ یہ چاروں ہم آہنگ اور ہم بستہ کام وہ دراصل دو دیگر فرائض کی بجا آوری کے لیے کرتا ہے۔

پہلا (یعنی پانچواں) تو یہ ہے کہ وہ کسی بھی ٹاسک یا فریضہ یا ضرورت کے لیے سارے حسیاتی علم کی مدد لے کر پراسیسنگ کا زبردست اور پیچیدہ کام کرتا ہے۔ برین پراسیسنگ کا دنیا کا سب سے بڑا کارخانہ ہے۔

6۔ دوسرا (یعنی چھٹا اور آخری) کام وہ یہ کرتا ہے کہ پراسسنگ کے بعد انسان سے جو کام کروانا ہے اُس کا جامع اور کلیئر کٹ حکم دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ انسان صرف خارجی اشیا کا علم ہی حاصل نہیں کرتا بلکہ اپنے عمل سے خارجی دنیا پر اثر انداز بھی ہوتا ہے، اُسے بدلتا بھی ہے۔

کمال یہ ہے کہ حکم یا آرڈر کا پیغام لے جانے والے آلات وہی ہوتے ہیں جو اُس کے انفارمر یا جاسوس بھی ہیں۔ جیسے کہ یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ممالک کی انٹیلی جنس ایجنسیاں جاسوسی کرتی ہیں مگر بعد میں پتہ چلا کہ وہ صرف جاسوسی نہیں کرتیں بل کہ عملی کارروائیاں بھی وہی کرتی ہیں۔ امریکی سی آئی اے نے محض جاسوسی نہ کی، اُس جاسوسی پہ ردِعمل کرتے ہوئے دنیا کے ممالک کو برباد بھی کر کے رکھ دیا۔ یہی کچھ برین کے جاسوسی والے اوزار کرتے ہیں۔ وہ جاسوسی بھی کرتے ہیں اور ان میں سے بالخصوص ہاتھ، پاؤں اور آنکھ برین کے احکامات پر عمل درآمد کرنے کے ہر کارے بھی ہیں۔ اب یہ آلات صرف حکم کا پیغام نہیں لے جاتے بل کہ عمل درآمد کے ذمہ دار بھی یہی ہوتے ہیں۔ عمل درآمد کے ہرکارے!

اب ذرا غور کریں کہ اگر دماغ ہی موجود نہ ہو یا کام نہ کر رہا ہو تو وہ سارے چھے کے چھے کام نہ ہوسکیں گے جو انسانی زندگی کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ اس قدر ضروری کہ یہ نہ ہوں تو

انسان حیوان سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔

یہ سمجھنا بھی غلط ہوگا کہ دماغ سوچنے کی ایک آٹو میٹک مشین ہے۔ بھئی اسے اپنے جسم، اور جسم کے گردوپیش کی دنیا سے الگ کر دو تو یہ ''مبارک ہوٹل'' میں مغز کے نام سے سالن بن جاتا ہے۔ مغز تو اپنے کارندوں کے بغیر بے کار ہے۔ حواس اُس کے لیے جاسوس بن کر گردوپیش کی اطلاعات اُسے فراہم کرتے ہیں۔ میٹریل دنیا کی اطلاعات۔ ان ہی شبیہوں کو پراسیس کر کے مغز نئی نئی شکلیں صورتیں تخلیق کر سکتا ہے۔ گو کہ کمپیوٹر بھی چیزیں یاد رکھ سکتا ہے، محدود پیمانے کی چھان بین بھی کر سکتا ہے اور حل بھی۔ مگر سوچنا صرف انسان کا وصف ہے۔ مغز ہی کمپیوٹر کی ساری ''صلاحیتوں'' کی تعمیر کرتا ہے۔ خواہ یہ جتنی بھی پیچیدہ کیوں نہ ہوں۔ کمپیوٹر اور دیگر ساری مشینیں انسانی مغز اور دست و بازو کے کام کرنے کی صلاحیتوں کو سہولت فراہم کرنے کے محض اوزار ہیں اور مغز کا کام ہے: سوچنا، فیصلہ کرنا اور اس پر عمل کروانا۔

سوچنا مغز کا کام، اور مغز کی محنت ہے۔ تو یہ بھی طے ہو گیا کہ محنت صرف اور صرف انسان کی خاصیت ہے۔ اس لیے کہ اس میں مغز اور شعور شامل ہوتا ہے۔

صرف برین ہی نہیں بل کہ تمام جاندار میٹر اپنے ماحول سے مطابقت اختیار کرتا ہے (اس لیے کہ اس کی بقا اسی میں ہے، ورنہ تو وہ مر جائے گا۔ جان دار میٹر کی فزیکل اور آرگینگ صفت ہے کام کرتے رہنا۔ فطرت کے دیگر اعضا کی طرح مغز (نیوران جس کا یونٹ ہے) بھی ساکت و بے کار نہیں رہ سکتا۔ بازو اور ٹانگ کے پٹھوں اور سیلز (Cells) کی طرح مغز اور اُس کے سیلز کی یہ طبعی ضرورت اور مجبوری ہے کہ وہ حرکت کریں، ورزش کریں، صحت مند رہیں، اپنے آپ کو قائم رکھیں اور آگے بڑھیں۔

عام اصطلاح میں تجسس انسانی برین کا بنیادی اور مستقل فناں مناں ہے۔ اپنی آرگینگ صفت کے باعث مغز کام کرنے پر مجبور ہے۔ یہ جب سرگرم ہوتا ہے تو خوش رہتا ہے اور جب بے کار ہوتا ہے تو خفا اور مرجھا جاتا ہے، غیر مطمئن رہتا ہے۔ (1)

3۔ بیرونی دنیا

ہم نے شعور کے لیے ضروری آرگنز یا اعضا کے نام تو لیے مگر ہمیں تیسری چیز ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے۔ یعنی یہ کہ ناک میں خوشبو کہاں سے آتی ہے، آنکھ کے دیکھنے کی بات تو ہم کر چکے مگر اِن نظاروں کا منبع کیا ہے، کانوں میں آنے والی آوازوں کا سرچشمہ کیا ہے۔ ٹچ اور ٹمپریچر کے سورس بھی تو باہر ہیں۔

یہ تیسری اور مساوی طور پر اہم چیز ''بیرونی دنیا'' ہے۔ بیرونی دنیا نہ ہو تو کیا نوزائیدہ، کیا میچور شخص، کچھ بھی جانا نہیں جا سکتا۔ کچھ بھی کیا نہیں جا سکتا۔ انسانی بچہ پرندوں کو اڑتا نہ دیکھتا تو بڑا ہو کر ''رائٹ برادران'' پیدا نہ کرتا۔ لکڑی کے بڑے تختے کے تیرتے رہنے اور لوہے کی معمولی کیل کو ڈوبتے ہوئے نہ دیکھتا تو سمندر کے سینے پہ ہزاروں ٹنوں کے بحری جہاز نہ دوڑا سکتا۔ بہ ہر حال ہماری ساری سوچ، خیال، اور کارنامے ہم سے باہر کی میٹیریل دنیا کے فریم میں ممکن ہیں۔ چناں چہ ''انسان کے علم کا سرچشمہ، اُس کا شعور دراصل اُس کے آس پاس کی دنیا ہے۔'' اور یہی آس پاس کی میٹریل دنیا اُس کے عمل کا میدان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انقلابی جماعت کسی پہلوان، پنڈت اور فردِ واحد کی خیالی باتوں اور اُس کی خواہش یا حکم کو اپنے عمل کی بنیاد نہیں بناتی۔ وہ تو سماج کی اصل میٹریل حالت پہ نظر رکھتی ہے۔ سماج کی اپنی میٹریل ضرورتوں کو جانچ کر اُن کے حصول کے لیے کوششیں تیز کرتی ہے۔ اُس سارے کام کے لیے اس کا سماج کی اصل زندگی سے پیوست رہنا ضروری ہوتا ہے۔ ارادہ خواہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو، تاریخی قوتوں کو ضرور دیکھنا ہوتا ہے۔

4۔ عمل

جاننے یا علم کے لیے چوتھی چیز موجود نہ ہو تب بھی ہماری جان داری کا استحقاق مجروح رہتا ہے۔ وہ چوتھی چیز ہے: عمل۔ عمل کمال کی چیز ہوتا ہے۔ دیکھیے، انسان کی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ اُن کی برآوری کے لیے اس نے محنت کرنی ہوتی ہے، عمل کرنا ہوتا ہے۔ اس محنت یا عمل کو ''پیداواری

عمل‘‘ کہتے ہیں۔اس عمل میں اس کا ڈائریکٹ آمنا سامنا خارجی دنیا سے ہوتا ہے۔ یہاں اب اُس نے نئے نئے تجربات کرنے ہوتے ہیں۔ یہی تجربات بعد میں اس کا علم بن جاتے ہیں اور وہ اگلی بار اسی علم کو بروئے کار لا کر اپنے پیداواری عمل کو تیز اور زیادہ پیداواری بناتا ہے۔ نئی مشینیں بناتا ہے، نہریں کھودتا ہے، سڑک اور پل بناتا ہے۔

یعنی علم ، برین ، اُس سے بیرونی دنیا کے وجود، حسیات کی موجودگی اور بیرونی دنیا پہ انسانی عمل کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے اور انسانی سرگرمی کا مطلب ایک فرد نہیں بل کہ انسانی سماج ہوتا ہے۔

اسی سارے پراسیس میں جہالت سے جاننے کی طرف، وہاں سے زیادہ جاننے کی طرف اور بالآخر مکمل جاننے کی طرف رواں سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسانی عقل پیدائشی موجود نہیں ہوتی بل کہ ماحول اُس کے ذہن پر تاثرات نقش کرتا ہے۔ پھر مشق اور تجربہ اس کو ترقی دیتے جاتے ہیں۔ انسانی علم قدم بہ قدم نشوونما پاتا جاتا ہے، نچلی سے بلند تر سطح کی طرف، اتھلائی سے گہرائی کی طرف، ایک پہلو سے ہمہ پہلو کی طرف۔ یہی مشاہدہ اور مشق سے حاصل شدہ قابلِ تصدیق حقائق ہی کو علم کا درجہ حاصل ہے۔

علم کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ آپ ایک معمہ حل کریں، ایک سوال کا جواب تلاش کریں تو وہ جواب اپنے اندر سے دو نئے سوالات کھڑے کر دیتا ہے۔ علم نیچر اور میٹر پر پیداواری عمل کے دوران پیدا ہوتا ہے، بہ تدریج بڑھتا ہے۔ ایک وقت تک کی دریافتیں آنے والی نسلوں کے لیے مواد فراہم کرتی ہیں جس کی بنیاد پر اگلی نسل اس کو آگے بڑھاتی ہے۔ یوں علم کبھی مکمل ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ جوں جوں انسان فطرت یا میٹر کی تسخیر کرتا جائے گا، علم بڑھتا چلا جائے گا۔

یہ بھی دیکھیے کہ میٹر اور کائنات کے بارے میں جو نتائج جن تجربات سے اخذ کیے جاتے ہیں وہ ہر خاص و عام کی دست رس میں ہوتے ہیں۔ کوئی بھی شخص، کسی بھی زمانے میں اور کسی بھی مقام پر انہیں دوہرا سکتا ہے۔ ان سائنسی حقائق والے نتائج سے عمومی قوانین اخذ کیے جاتے ہیں۔

انسان پہلے پہل تو خارجی اشیا کو دیکھتا سونگھتا یا چکھتا ہے۔ اس عمل کے ذریعے وہ ان اشیا

کو سمجھنے لگتا ہے۔ یہ ادراکی علم جب تک مزید عمل میں نہ جائے، ترقی نہیں کر سکتا۔ چلنے کا عمل آج بھی جانوروں جتنا رہتا اگر انسان پاپوش نہ بناتا، جانوروں کو سواری کے بہ طور استعمال کرتے کرتے ہائی ویز اور ترقی یافتہ کار موٹر نہ بناتا۔ دوسرے شعبوں میں بھی یہی صورت تھی۔ اس لیے کہ انسان کا سماجی عمل صرف پیداوار کے اندر سرگرمی تک محدود نہیں ہوتا۔ اس سماجی عمل کی کئی شکلیں ہوتی ہیں: کلاس سٹرگل، سیاسی زندگی، سائنسی اور آرٹسٹی شاہ پارے۔ دوسرے لفظوں میں ایک سماجی وجود کے بہ طور انسان سماج کی عملی زندگی کے سارے شعبوں میں حصہ لیتا ہے۔ بالخصوص کلاس سٹرگل انسانی علم کی نشوونما پر زبردست اثر ڈالتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں علم عمل کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ پرسپشنل علم عمل سے حاصل (acquire) کیا جاتا ہے اور یہ پھر واپس عمل میں چلا جاتا ہے۔ حسیاتی علم پہ عمل ہوا تو علم بنا۔ اس علم کو مزید عمل میں ڈالا تو مزید علم بنا۔ اسی دائرے میں سے تو ہر ہر شعبہ کی سائنس نکلی، ٹکنالوجی نکلی۔ آلات، سادہ سے پیچیدہ آلات، ادنی سے اعلیٰ آلات۔ ایسے لگتا ہے کہ خارجی دنیا، برین، عمل اور آلات، گاڑی کے چار پہیے کی صورت موجود ہیں۔

اِدھر ہی کہیں علم کی پانچویں انگلی بھی سامنے آجاتی ہے: نظریہ۔ نظریہ لگتا ہے علم یا علوم کا نچوڑ بن چکا ہو۔ سچائی کا گہرا انعکاس کنندہ۔

ان سارے کاموں سے اُسے مزید علم حاصل ہوتا ہے۔ وہ مزید قوانین دریافت کرتا ہے اور خارجی دنیا کو مزید تسخیر کرتا جاتا ہے۔ یہ سارا کام چوں کہ مزدور پیشہ لوگ کرتے ہیں اس لیے وہ اپنا نظریہ بناتے ہیں۔ مارکسزم اسی نظریے کا نکھرا ہوا روپ ہے۔

علم (نظریہ) خود انقلاب و تبدیلی نہیں لاتا۔ وہ تو عمل کے گائیڈ اور ساتھی اور معاون کے بہ طور کام کرتا ہے۔ یہ بات بھی یاد رکھیے کہ عمل سے نظریہ وجود میں آیا، نظریہ سے عمل نہیں۔ ہاں، اب یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔

*****

نظریہ، عمل کا رہ نما بن جاتا ہے۔ یوں نظریہ اور عمل ایک طرح کی وحدت بناتے ہیں،

ایک دوسرے کا سہارا اور جوڑی بناتے ہیں۔ ایک دوسرے سے مدد لیتے ہوئے ایک دوسرے کو ڈویلپ کرتے جاتے ہیں۔ یہ دونوں متحرک رہتے ہیں۔ ہمہ وقت رواں، ہمہ وقت تازہ، ہمہ وقت جواں، ہمہ وقت مستعد اور ہمہ وقت معروضی۔

سماجی شعور خیالات، نظریات، نقطہ ہائے نظر، سماجی جذبات، عادات اور اطوار کا مجموعہ ہوتا ہے۔ انسانوں کے سماجی وجود کا انعکاس سماجی شعور کرتا ہے۔

طبقاتی سماج میں سماجی شعور ایک طبقاتی کردار کا حامل ہوتا ہے۔ ایک خاص طبقے کے سیاسی، قانونی، اخلاقی، فن کارانہ اور دیگر خیالات ونظریات کا مجموعہ اُس کی آئیڈیالوجی کی تشکیل کرتا ہے۔

ایک ایسا سماج جسے مخاصمانہ طبقاتی تضادات نے چیر پھاڑ کر رکھا ہو، وہاں ایک واحد آئیڈیالوجی ممکن ہی نہیں ہوتی۔ استحصال کرنے والے اور استحصال کے شکار طبقات کی اپنی الگ الگ آئیڈیالوجی ہوتی ہے۔ کلاس سٹرگل کی ایک شکل کی حیثیت سے گہری نظریاتی جدوجہد ہمیشہ ایک مخاصمانہ طبقاتی سماج کی خصوصیت رہی ہے۔

سماج کی نشوونما میں خیالات کے فعال رول سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ نظریہ جب عوام الناس کے دل و دماغ میں گھر کر لیتا ہے تو پھر یہ ایک میٹریل قوت بن جاتا ہے۔ اس قوت کی موجودگی کے بغیر ہر عمل، ہر جدوجہد اور ہر لڑائی اندھیرے میں تیر چلانے جیسی ہے۔

اصل میں معروضی دنیا کے قوانین کو سمجھنا اور نتیجتاً اس کی تشریح کرنا، سب سے اہم نہیں ہے بل کہ دنیا کو بدلنے کے لیے ان قوانین کے علم کا سرگرمی سے اطلاق کرنے کے قابل ہونا سب سے اہم ہے۔ تھیوری اہم ہے۔ یعنی انقلابی تھیوری کے بغیر انقلابی تحریک نہیں ہوسکتی۔ مگر تھیوری فقط اور فقط اس لیے اہم ہے کہ یہ عمل کو گائیڈ کرسکتی ہے۔ اگر ہمارے پاس زبردست تھیوری موجود ہے اور ہم اسے بار بار رٹتے بھی ہیں مگر اسے عمل میں نہیں ڈالتے تو یہ ٹکے کی بھی نہیں رہتی۔

علم کا سرگرم کام خود کو محض ادراکی (Perceptual) سے استدلالی (Rational) علم کی طرف سرگرم چھلانگ میں اظہار نہیں کرتا بل کہ اسے استدلالی (Rational) علم سے

انقلابی عمل کی طرف چھلانگ میں اظہار کرنا لازم ہے۔ وہ علم جو دنیا کے قوانین کو گرفت میں لیتا ہے، اسے دنیا کو بدلنے کے عمل کی طرف دوبارہ رجوع کرنا ہوگا، اسے از سرنو پیداواری عمل میں استعمال کرنا ہے، انقلابی کلاس سٹرگل، اور سائنسی تجربے کے عمل میں۔ یہ تھیوری کو ٹیسٹ کرنے اور ترقی دینے کا پراسیس ہے۔ مزدور کلاس کی پارٹی اپنے نظریے کی بنیاد سماج کی موجودہ ساخت، سماج کے اندر کارفرما معاشی طاقتوں، سماج کے اندر مختلف طبقوں کی اصل حیثیت اور اِن مختلف طبقوں کے تصورات وغیرہ کے علم پہ رکھتی ہے۔

سماجی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے جو انقلابی عزم درکار ہوتا ہے اس کی لازمی شرط سماج کے ابھرتے ہوئے عناصر میں انقلابی شعور کی تربیت ہے۔ شعور کی اس تربیت میں برسوں صرف ہوتے ہیں۔ یعنی سماجی انقلاب سے پیش تر فکری انقلاب لانا پڑتا ہے۔

سماج میں جا بجا آپ کو یہ کوٹیشن نظر آتا ہے کہ علم بہت ضروری ہے۔ مگر ہم اکثر اوقات علم کے ساتھ عمل کے اہم رشتے کو بھول جاتے ہیں یا اسے ثانوی بناتے ہیں۔ اسی وجہ سے ایک دانش ور نے ''علم'' کے باب کو علم کے بجائے ''عمل'' کے عنوان سے لکھا تھا۔

اگر آپ کوئی چیز ڈائریکٹ جاننا چاہتے ہیں، تو آپ کو شخصی حقیقت کو تبدیل کرنے کے لیے عملی طور پر سٹرگل میں حصہ لینا ہوگا۔ علم کا یہی راستہ ہے جس پہ ہر شخص نے سفر کرنا ہے۔ کسی چیز کو جاننے کے لیے بالعموم اور اسے تبدیل کرنے کے لیے بالخصوص، اس چیز یا مظہر کے اندر کودنا پڑتا ہے، حصہ لینا پڑتا ہے۔ اگر آپ نے انقلاب کی تھیوری اور طریقے جاننے ہیں تو آپ کو انقلاب میں حصہ لینا ہوگا۔ سارا جینوئن علم ڈائریکٹ تجربہ سے شروع ہوتا ہے۔

مگر ایک شخص ہر چیز کا ڈائریکٹ تجربہ نہیں کرسکتا۔ دراصل ہمارے علم کا بہت بڑا حصہ مثلاً دور دراز کے خطوں اور ماضی کے زمانوں کا علم ہمیں اِن ڈائریکٹ تجربے سے ملتا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد کے لیے تو یہ علم ڈائریکٹ تجربے سے آیا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کے پاس جو علم ہوتا ہے وہ دو طریقوں یعنی ڈائریکٹ اور انڈائریکٹ تجربوں سے آتا ہے۔ جو علم میرے لیے ڈائریکٹ تجربے سے آیا وہ ہوسکتا ہے کہ دوسروں کے لیے اِن ڈائریکٹ تجربات سے آیا ہو۔ یعنی

کسی بھی طرح علم کو ڈائریکٹ تجربے سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے تو ''عالمِ کل'' مضحکہ خیز شخص ہوتا ہے۔

''تھیوری اگر انقلابی عمل کے ساتھ کنیکٹڈ نہ ہوتو یہ بے مقصد ہوجاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ عمل کا راستہ اگر انقلابی تھیوری سے روشن نہ ہوتو یہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔

اسی لیے ''ہمہ دان'' اور ''اتھارٹی'' جیسے الفاظ غلط الفاظ ہیں۔ ویسے بھی علم اتنا سچا، اتنا سائنسی ہوتا ہے کہ دیانت اور انکساری اس کی ضرورت ہیں۔ چناں چہ دنیا کا سب سے مضحکہ خیز شخص وہ ہے جو ''عالمِ کُل'' ہے یا جو ''دنیا کا نمبرون اتھارٹی ہے۔''

عمل کے دوران اَن دیکھی صورت حال نظر آتی ہے۔ اس لیے آئیڈیاز، تھیوریز، منصوبے یا پروگرام عموماً جزوی طور پر اور کبھی کبھی تو مکمل طور پر تبدیل کیے جاتے ہیں۔ انقلابی وقت میں تو صورت حال تیزی سے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اُس وقت اگر انقلابیوں کا علم تبدیل شدہ صورت حال کی مطابقت میں تیزی سے نہیں بدلے گا تو وہ انقلاب کو فتح تک راہ نمائی کے قابل نہ ہوں گے۔

ریفرنسز

1۔ اسلم اظہر۔ مضمون، آرٹ کا جدلیاتی تصور، در کتاب ''جدلیات'' ادب وفن اور پائیدار ترقی۔ 2012ء۔ ایس ڈی پی آئی۔ صفحہ 14

بنیاد اور بالائی ڈھانچہ

Base & Supersturcture

دلچسپ ہے کہ سماج صرف ''انسانی سماج'' کو کہا جاتا ہے۔ کبھی گھوڑوں کا سماج، چیونٹیوں، ڈاچیوں کا سماج نہیں سنا۔ نہ کبھی پہاڑوں، ہواؤں، قبروں یا جنوں پریوں کا سماج پڑھنے سننے میں آتا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ سماج صرف زندہ انسانوں کا ہوتا ہے۔

مگر ایسا کیوں ہے؟ کون سے انسانی کمال نے اُسے سماج کا مالک بنایا؟

اپنی ''اشیائے ضرورت'' خود پیدا کرنے کی صلاحیت نے انسان کو سماج میں ڈھال دیا۔

صرف ایک ضرورتِ مشترک طور پر سارے جان داروں میں موجود ہوتی ہے: خوراک۔ یہ گویا انسان میں بھی بنیادی ترین ضرورت ہوتی ہے۔ مگر جان دار اپنی خوراک خود پیدا نہیں کرسکتے۔ وہ نیچر میں موجود جڑی بوٹیوں پھلوں یا ایک دوسرے کے گوشت کو چیر پھاڑ کر کچا کھا کر گزارا کرتے ہیں۔ انسان اپنی خوراک خود پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

خوراک کے بعد انسان کو موسموں کی شدت سے بچنے کے لیے دو مزید ضرورتوں نے آن گھیرا: ایک پوشاک اور دوسرا سر چھپانے کو جگہ۔ پوشاک کی ضرورت جانوروں کو نہ تھی۔ اس لیے کہ اُن کو سائبیریا، زیارت اور ہر بوئی، جیسے سرد علاقوں میں لمبے لمبے بالوں کی سہولت موجود تھی جب کہ سبی اور جیکب آباد جیسے گرم موسموں میں اس کی کھال پہ برائے نام بال ہوتے ہیں۔ انسان کے جسم پہ

بال لمبے چھوٹے کرنے کی سہولت نہ تھی۔ اس سردی سے بچنے کے لیے اُسے بڑے بڑے بالوں والے جانوروں کی کھال پہننا پڑی اور پھر آہستہ آہستہ اسے ترقی دیتے ہوئے پورا لباس تیار کرنا پڑا۔

تیسری ضرورت بھی موسموں کی شدت نے پیدا کی: رہائش کی۔

یوں یہ تین بنیادی ضرورتیں ہیں انسان کی۔ مگر ضرورتوں کی یہ تینوں اشیا کی لسٹ مبہم ہے۔ اس لیے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضروریات بڑھاتا رہا ہے۔ اکیسویں صدی کی ضرورت یعنی موبائل فون ایک صدی پہلے تک ایک تصور بھی نہ تھا مگر آج اس نے بنیادی ضرورت کی صورت اختیار کر لی۔ ٹرانسپورٹ، کرنسی، صحت، تعلیم، وغیرہ۔ مطلب یہ کہ خوراک، لباس اور مکان تو آج بھی بنیادی ضرورتیں ہیں مگر اُن کے ساتھ ساتھ دیگر بہت سی اشیا بھی اُس کی بنیادی ضرورت بنتی جا رہی ہیں۔ اپنی قوتِ محنت سے اپنی ضرورتوں کی پیداوار کرنے کی صلاحیت اسے ''سماج'' کہلوانے کے لیے کوالی فائی کرتی ہے۔

پیداواری سرگرمی کے لیے تین چیزیں اہم ہیں: انسان کی قوتِ محنت، آلات (آلاتِ پیداوار) اور ذرائع پیداوار۔ اِن تینوں چیزوں کے مجموعے کو ''پیداواری قوتیں'' کہا جاتا ہے۔

جب آپ اشیا پیدا کرتے ہیں تو آپ کو مل جل کر ایسا کرنا ہوتا ہے، ایک دوسرے سے وابستہ ہونا ہوتا ہے اور جس دن انسان سماجی پیداوار کرنے کے عمل میں ایک دوسرے سے بندھ گیا اسی دن سماج کی ابتدا ہوئی تھی۔ یہ جو بندھن ہے، پیداواری عمل کے دوران، اس بندھن کو پیداواری رشتے کہا جاتا ہے۔ پیداواری قوتیں اور پیداواری رشتوں میں اتحاد کو سماج کا معاشی نظام کہتے ہیں۔ ان ہی پیداواری رشتوں کے اندر پیداواری قوتیں ترقی کرتی جاتی ہیں۔

پیداواری رشتوں کو دیکھنے کا ایک دوسرا طریقہ بھی ہے۔ پیداواری رشتے ذرائع پیداوار اور آلاتِ پیداوار کی نجی ملکیت کا نام ہے۔ نجی ملکیت وہ شیطانی جڑ ہے جو سماج کے اندر تا دمِ مرگ باہم لڑنے والے دشمن طبقات پیدا کرتی ہے۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ آرٹسٹوں کو ''پنڈورا باکس'' کا قصہ بنانے کی کیوں ضرورت پڑی جب کہ اُن کے پاس ''نجی ملکیت'' کا لفظ موجود تھا۔

اب ہم اس بات تک پہنچ چکے ہیں کہ سماج کی ''بنیاد'' معاشی نظام ہے۔ یہ درست ہے

کہ معاشی سرگرمی کے لیے کچھ اور چیزیں بھی مدد و معاون ہوتی ہیں اُن میں سے ایک جغرافیہ اور اس کا ماحول ہے۔ زراعت میں تو انسانی محنت کے علاوہ زرخیز زمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِن کی موجودگی میں سماج خوب ترقی کرتا ہے اور ان کی غیر موجودگی سماجی ترقی کی رفتار کو کم کرتی ہے۔

سماج کی ''بنیاد'' یعنی base (یعنی معاشی نظام کو چلانے اور برقرار رکھنے کے لیے base) پر قابض طبقہ نے سیاسی نظام بنایا، نظریاتی نظام بنایا، اخلاقی نظام بنایا۔ مطلب یہ کہ یہ تینوں یعنی سیاسی نظام، نظریاتی نظام اور اخلاقی نظام سماج کا base نہیں ہیں بل کہ یہ اس کا بالائی ڈھانچہ (سُپر سٹرکچر) ہیں۔ یہ سب کے سب اُس سماج کے معاشی نظام پہ، اور اُس کی مطابقت میں استوار ہوتے ہیں۔ یعنی معاشی نظام base (بنیاد) ہے اور باقی سارا کچھ، جی ہاں، سارا کچھ اُس بیس کا بالائی ڈھانچہ ہوتا ہے۔ سماج کا بالائی ڈھانچہ سماج کے قانونی، سیاسی، ثقافتی، معاشی، سائنسی، فلاسوفیکل، اخلاقی، جمالیاتی اور عقیدتی نظریات پر اور اُن تمام سے مطابقت رکھنے والے اداروں، تنظیموں، سیاسی پارٹیوں، اور ریاست وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔

سماج کی بنیاد یعنی معیشت تو پیداواری رشتوں پہ انحصار کرتی ہے۔ یہی پیداواری رشتے سماج کے سارے ڈھانچے کی بنیاد بناتے ہیں۔ سماجی زندگی میں یہ بنیاد زبردست کردار ادا کرتی ہے۔ یہی بنیاد سماج کے بالائی ڈھانچے کو سہارا دیتی ہے اور مستحکم کرتی ہے۔ یعنی بالائی ڈھانچہ بنیاد کے بغیر نہ تعمیر ہو سکتا ہے اور نہ ٹھہر سکتا ہے۔ بنیاد موجود تو اوپر کا ڈھانچہ بن ہی جاتا ہے۔ سر سلامت تو ٹوپیاں بہت۔

یوں یہ دونوں اکٹھے رہتے ہیں۔ ہر بالائی ڈھانچے کی ایک بنیاد ہوتی ہے اور ہر عمارت یعنی سپر سٹرکچر کی ایک بنیاد ہوتی ہے۔ لازم و ملزوم۔ ایک نہیں تو دوسرا بھی نہیں۔ یہ رندو لاشار باہم بھائی بھی ہیں مگر ایک دوسرے کی جڑیں اکھاڑنے کے درپے بھی..... (بلوچی فوک شعر)۔

قدیم کمیونزم سے قبل چوں کہ کوئی نظام موجود نہ تھا اس لیے اُس کی معاشی بنیاد اُس کے قیام کے ساتھ ہی ہوئی تھی۔ بقیہ جو تین نظام ہیں یعنی غلام داری سماج، فیوڈلزم، اور کپٹلزم، وہ تینوں مخاصمانہ نظام ہیں اور اُن کی معاشی بنیاد اپنے سے قبل والے معاشی نظاموں کے اندر بننے لگی تھی۔

یعنی غلام دارانہ سماج کی بنیاد کی ابتدا قدیم کمیونزم میں پڑی، فیوڈلزم کی غلام داری نظام میں اور کیپٹلزم کی بنیاد فیوڈلزم میں پڑی۔

کمال یہ ہے کہ اِن سارے نظاموں کی بنیاد کسی شعوری جدوجہد کے بغیر ہوئی تھی اور اُن کے صرف آخری مراحل میں کہیں کہیں شعوری جدوجہد کی ضرورت پڑی۔ مگر سوشلزم کی بنیاد ایسی ہے جو شعوری جدوجہد کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی بل کہ یہ اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب مزدوروں کی سیاسی پارٹی، سوشلسٹ انقلاب برپا کردے گی۔

جیسے کہ ذکر ہوا، کہ جیسی بیس ہوگی سُپر سٹرکچر اسی طرح کا ہوگا۔ قدیم کمیونزم میں طبقاتی نظام والی base نہ تھی اسی لیے وہاں بالائی ڈھانچہ کے بہ طور نہ تو کلاسز تھیں، نہ کلاس تضادات تھے، نہ سیاست تھی، نہ خیالات ونظریات تھے اور نہ سٹیٹ تھی۔

اگلا سماجی مرحلہ غلام داری کا تھا۔ چوں کہ یہاں سماج یعنی بیس بنیادی نجی ملکیت تھی، اس لیے طبقات اور طبقاتی تضادات وجود میں آ گئے۔ اس بنیاد کی مطابقت میں بالائی ڈھانچہ ایسے خیالات والا بنا جس میں غلام داری کو جائز اور اچھا قرار دیا جاتا۔ ادارے ایسے وجود میں آ گئے جو غلاموں کے خلاف آقاؤں کی بالادستی اور ان کے طبقاتی مفادات کا تحفظ کرتے تھے اور سب سے منظّم ومتنوع ادارہ تو ریاست یعنی سٹیٹ کے نام سے وجود میں آیا۔ جو آقا اور غلام کے طبقاتی تضادات کو دبانے کے لیے اور آقاؤں کے طبقاتی مفادات کے تحفظ کے لیے تھا۔ یہی کچھ فیوڈلزم میں تھا اور ایسا ہی کیپٹلزم میں ہے۔

طبقاتی معاشرے کی بنیاد یعنی base کے اندر ہی لڑائی ہو رہی ہوتی ہے۔ وہاں حاکم اور محکوم دونوں موجود ہوتے ہیں اور یہ دونوں باہم متضاد ہوتے ہیں۔ غلام داری میں غلام اور آقا، فیوڈلزم میں فیوڈل اور کسان، کیپٹلزم میں کیپٹلسٹ اور مزدور۔ مطلب یہ کہ ان تینوں سماجوں کی بنیاد (base) متضاد مفادر کھنے والے طبقات کے تعلقات پہ استوار ہے۔ اندازہ کیجیے کہ ایسی بیس جس کے اپنے اندر کشت وخون والا تصادم چل رہا ہوتا ہے تو اُس کا پھر بالائی ڈھانچہ کیسا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ بھی مخاصمانہ تضادات والا ہوگا۔ مطلب یہ کہ کیپٹلزم کا بالائی ڈھانچہ یعنی اس کے خیالات و

نظریات بھی باہم متصادم ہوں گے۔ وہاں کیپٹلسٹ کے اپنے خیالات اور ادارے ہوں گے اور مزدوروں کے اپنے اور اِن دونوں کے خیالات واداروں پر مشتمل بالائی ڈھانچہ ہوگا۔

ایک بات واضح ہونی چاہیے: وہ یہ کہ ہر طبقاتی سماج میں معاشی بالادستی صرف ایک طبقے کی ہوتی ہے۔ اس لیے خیالات، نظریات، سیاست، سیاسی پارٹی پہ مشتمل اداروں والا بالائی ڈھانچہ بھی اسی طبقے کی بالادستی والا ہوگا۔ کیپٹلزم میں سائنس، علم، ادب، آرٹ سب کیپٹلزم کی خدمت کرتے ہیں۔ یہ بالائی ڈھانچہ مزدور طبقے کو کیپٹلزم کے ازلی ابدی ہونے کا باور کراتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ بیس ساری چیزوں کا تعین کرتی ہے مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ سُپر سٹرکچر، بیس کا محض ایک ٹٹو ہے۔ بالائی ڈھانچہ، بیس کا محتاجِ محض اور غیر مفعول شو پیس بالکل نہیں ہوتا۔ بالائی ڈھانچہ بیس کو بہت مستحکم بھی کرسکتا ہے مگر اگر اس کے دماغ پہ شیطان سوار ہو جائے تو یہ وقتی طور پر بیس کی بیخ اکھاڑنے کا سامان بھی کر جاتا ہے۔ یعنی نظریات، سیاست اور خیالات بیس کے استحکام اور تعمیر کا کام بھی کرتے ہیں اور تباہی کا کام بھی۔ سپر سٹرکچر بیس کے استحکام، تعمیر یا پھر تباہی کے سلسلے میں انسانوں کو اپنے خیالات کو بروئے کار لانے میں مدد دیتے ہیں۔ نیز اگر یہ بالائی ڈھانچہ بیس سے ہم آہنگ ہو تو پیداواری قوتوں کی ترقی میں مدد دیتا ہے۔

بالائی ڈھانچہ اگر شرافت دکھائے تو وہ ایک اور زبردست کام یہ کرتا ہے کہ اپنی اب سے پہلے والی بیس کو ختم کر کے نئی بیس کے قیام واستحکام میں مدد دیتا ہے۔

مطلب یہ کہ بالائی ڈھانچہ ''بیس'' کے ساتھ پابہ گل بھی ہے اور تھوڑا تھوڑا آزاد بھی۔ شروع میں تو بالائی ڈھانچہ اپنی بیس کے ایجنٹ کا رول ادا کرتا ہے۔ یہ اپنے جنم دینے والی بیس کو جائز ثابت کرنے کے لیے دلائل گھڑتا جاتا ہے، اس کا فکری اور طبعی طور پر دفاع کرتا رہتا ہے۔ بالائی ڈھانچہ مخاصم طبقات میں سے غیر حاوی طبقہ کو مارتا پیٹتا ہے، اسے نقصان پہنچاتا ہے۔

بالائی ڈھانچہ ایک اور کام بھی کرتا ہے۔ نئے سماج کا بالائی ڈھانچہ اپنے سے پہلے والے سماج کی بنیاد کو تار پیڈو کرنے کے لیے اُس کے بالائی ڈھانچے میں شامل ہو جاتا ہے اور اُس بنیاد کو اور اُس کے بالائی ڈھانچے کو دیمک لگاتا جاتا ہے۔ کیپٹلزم کا بالائی ڈھانچہ تو سابقہ فیوڈلزم میں ہی

پیدا ہونے لگا تھا۔ وہ محسوس اور غیر محسوس طور پر خود کو Assert کرتا جاتا ہے۔ مقابل آنے والے کی چونڈیاں کاٹتا جاتا ہے۔ اُس کا خون چوس چوس کر فروغ پاتا جاتا ہے۔

مگر کبھی کبھی اُس کا الٹ بھی ہوتا ہے۔ نئے کپٹلزم میں پرانے فیوڈلزم کے بالائی ڈھانچہ کے جو اجزا زندہ رہ جاتے ہیں۔ اگر اُن سے خبردار رہتے ہوئے، تنقیدی فضا بنا کر انھیں جذب نہ کیا جائے تو وہ بہت نقصان دِہ ثابت ہوتے ہیں۔

اِدھر موجود ایک اور چھوٹی سی ٹیڑھ کا سمجھنا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ یہ درست ہے کہ سماج تو ایک جاری و ساری مظہر ہوتا ہے، یہ بنتا بدلتا ہے۔ بنیاد ہی بالائی ڈھانچہ کو جنم دیتی ہے اور بنیاد کی موت کے ساتھ بالائی ڈھانچہ بھی فوت ہو جاتا ہے مگر ایسا، میکانکی انداز میں نہیں ہوتا۔ چوں کہ سماج کی بنیاد اور بالائی ڈھانچہ دونوں زندہ اور متحرک مظاہر ہوتے ہیں، اس لیے بنیاد کی موت کی حتمی سیٹی بجنے سے بہت پہلے بالائی ڈھانچہ نئے سماج کی طرف ''بہت'' آہستگی سے بدلنے لگتا ہے۔ مثلاً کپٹلزم میں جاتے ہوئے فیوڈلزم کی بنیاد گرنے سے قبل اُس کا بالائی ڈھانچہ کپٹلزم کی جانب سرکنا شروع کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں فیوڈلزم کی بنیاد کپٹلزم میں بدلنے سے پہلے، فیوڈلزم کے بالائی ڈھانچے میں کپٹلزم کے جراثیم سرایت کرنے لگتے ہیں مگر فیصلہ کن بات بنیاد اور بیس ہی کی ہے۔

غلام داری، فیوڈلزم اور کپٹلزم تینوں میں چوں کہ پیداواری رشتے ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کے ہوتے ہیں، اس لیے تینوں سماجوں میں جبر، استحصال، افراتفری، نفسانفسی اور خودغرضی بھری ہوتی ہے۔

انسان سماج میں موجود پیداواری رشتوں کے اندر رہنے پہ مجبور ہوتا ہے۔ وہ اپنی ضروریات کے لیے ان ہی رشتوں کے اندر پیداوار کرتا رہتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی پیداوار بھی بڑھتی رہے اور مشقت بھی کم سے کم ہو۔ اس لیے وہ ہمہ وقت آلات پیداوار میں ترقیاں کرتا جاتا ہے اور اُس کی یہی خاصیت دراصل پیداواری رشتوں کا بھٹہ بٹھا دیتی ہے۔ آلات کے ترقی کرتے رہنے سے بالاخر طریقِ پیداوار بدل جاتا ہے۔ اس حد تک کہ موجود پیداواری رشتوں میں ترقی کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جب پیداواری

رشتوں اور پیداوری قوتوں میں شدید تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ اُن میں زبردست تصادم ہونے لگتے ہیں اور بالآخر پیداواری رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اور انسان کی تخلیقی محنت آزاد ہو جاتی ہے۔

آج دنیا کپٹلزم میں ہے جو آخری طبقاتی سماج ہے۔ اس کے ٹوٹنے سے طبقاتی سماج کی ساری زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں اور انسان ایک غیر طبقاتی سماج میں خوب آزاد اور بااختیار ہو جاتا ہے۔

کپٹلزم کی معاشی بنیاد بورژوازی اور پرولتاریہ کے درمیان مخاصمت کی عکاسی کرتی ہے۔ کپٹلسٹ سماج کے بیس کا یہی اثر اِس نظام کے بالائی ڈھانچے پر بھی رہتا ہے۔ یوں کپٹلزم کا بالائی ڈھانچہ یعنی خیالات اور ادارے بھی بورژوا بالادستی والے ہوتے ہیں اور یہ خیالات و ادارے بیس میں موجود نمایاں فریق (یعنی کپٹلسٹ) کی مدد اور حمایت کرتے رہتے ہیں۔ مگر اسی سماج میں پرولتاریہ بھی اپنی نجات کے خیالات رکھتا ہے، اپنی تنظیمیں (ٹریڈ یونین، سیاسی پارٹی) رکھتا ہے اور خود اپنے خیالات پیش کرتا ہے۔ پرولتاریہ اس سیاسی پارٹی کے توسط سے کپٹلسٹوں کے خلاف جدوجہد کرتا ہے۔ وہ اپنے نظریے یعنی مارکسزم سے لیس ہوتا جاتا ہے۔ اس کا مقصد کپٹلسٹ پیداواری رشتوں کو توڑنا ہوتا ہے۔ یعنی بورژوا سماج کی معاشی بنیاد کو تبدیل کرنا۔

کوئی نظریہ عمل ہی میں درست یا غلط ثابت ہوتا ہے۔ آزمائش اور اس کا نتیجہ، نتیجے کی کمی اور کوتاہیوں کو نئی حکمتِ عملی سے پھر عمل میں ڈالنا یہاں تک کہ مطلوبہ نتیجہ برآمد ہو۔ یہ پروسیس ہے کسی نظریے کی سچائی ثابت کرنے کا۔ نئی حکمت عملی بنا کر عمل میں ڈالنا حکمتِ عملی کا ارتقا ہے۔ نہ کبھی کوئی نظریہ جامد ہوتا ہے نہ حکمتِ عملی جامد ہوتی ہے۔ اگر حکمتِ عملی کو جامد سمجھ لیا جائے تو نظریہ بھی جامد رہتا ہے۔ یہاں تک کہ عقیدہ بن جاتا ہے۔

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ صرف میٹریل خیالات ہی زندگی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ جن خیالات کا میٹریل دنیا سے تعلق نہیں ہوتا وہ آپ کو پیداواری عمل میں نہیں ڈال سکتے۔ ایسے ماورائی خیالات آپ عمل میں نہیں ڈال سکتے اس لیے کہ ہمادی دنیا سے ماورا کچھ بھی ہماری پہنچ میں نہیں ہوتا۔ سماج اس لیے جاری ساری ہے کہ یہ ایک میٹریل وجود رکھتا ہے اور اس لیے ارتقا پذیر بھی رہتا ہے۔

اخلاقیات: اخلاقیات بالائی ڈھانچے کا ایک اہم رکن ہوتی ہے۔ یہ سماج کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ پرولتاری بین الاقوامیت پسندی، سوشلسٹ حب الوطنی اور انسان دوستی کا فروغ کمیونسٹ اخلاقیات کے اصول ہیں۔

سائنس: سائنس بہت بڑی نعمت ہے۔ انسان کے ہاتھ ایک ایسا وسیلہ جو اُس کی زندگی کو باسہولت بناتی ہے مگر کیپٹلزم کے اندر سائنس کیپٹلسٹ کے ہاتھ میں اپنے حریف کے خلاف لڑنے کا ایک وسیلہ ہے، زیادہ سے زیادہ منافع کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔

مختلف طبقات اور پارٹیوں کا نظریہ، فلسفہ، مذہب اور اخلاقیات کے ذریعے سائنس میں داخل ہوتا ہے۔ جو نظریہ کسی سماج پہ بالادستی پاتا ہے مختلف طریقوں سے سائنس دانوں پہ مسلط ہوجاتا ہے: روایات کے ذریعے سے، نظام تعلیم کے ذریعے سے اور بہ راہِ راست نظریاتی اور سیاسی اثر سے۔ سائنس دانوں کی سوچ کا عمومی ٹرینڈ بورژوا سماج کے حالات سے متاثر ہوتا ہے، جدید کیپٹلسٹ سماج میں آئیڈیلزم اور میٹافزکس کی بالادستی سے متاثر ہوتا ہے۔

بورژوا سماجی سائنس براہِ راست انداز میں کیپٹلزم کے دفاع، کیپٹلزم کے دم توڑتے ہوئے نظام کی لیپاپوتی اور کمیونزم اور ترقی کے خلاف شدید حملوں کے لیے وقف ہے مگر جب سماج کی نجی ملکیت والی معاشی بنیاد ڈھے جاتی ہے تو یہی سائنس کمیونسٹ سماج کی ہوجاتی ہے۔ جہاں یہ بغیر رکاوٹ ترقی کرتی جائے گی، نکھرتی جائے گی۔ نجی ملکیت کی خدمت کرنے کی شرط جو ہٹ گئی۔

آرٹ: سائنس کے برخلاف، ادب و آرٹ صداقت کا انعکاس تصورات میں نہیں کرتا، بل کہ ایسی ٹھوس شکل میں کرتا ہے جس کا حواس کے ذریعے ادراک کیا جاسکتا ہے۔ آرٹسٹ جن مقاصد اور آئیڈیلز کا اظہار کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ سماج اور عہد ہی سے آتے ہیں۔ آرٹسٹ تو خود ہی مخصوص سماجی رشتوں کی پیداوار ہوتا ہے۔ اُس کے جمالیاتی خیالات سماجی حالات کا عکس ہوتے ہیں۔

آرٹ سماج کے بالائی ڈھانچے کا ایک حصہ ہوتا ہے اور اس طرح یہ اس بنیاد (base) کو تقویت پہنچاتا ہے جس نے اسے وجود بخشا اور جس پر یہ فروغ پا رہا ہے۔ ایک طبقاتی سماج میں آرٹ پیداوار کی سطح کی ڈائریکٹ عکاسی نہیں کرتا بل کہ سماجی حالات، کلاس سٹرگل کے course

کا مجموعہ پیش کرتا ہے۔ تسلسل آرٹ کی ترقی میں بڑا رول پلے کرتا ہے۔ عالمی آرٹ کی عظیم کلاسیکل تخلیقات جن سماجی حالات میں وہ تخلیق کی گئی تھیں، اُن حالات کے غائب ہوجانے سے مرنہیں جاتیں بل کہ سماجی انسانی جذبات اور مُوڈز کا اظہار کرتی ہوئی ایک نئی زندگی جینا جاری رکھتی ہیں۔

آرٹ کا تعلق عوام سے ہے، اس کی جڑوں کو محنت کش عوام کے درمیان گہرائی کے ساتھ پیوست ہونا چاہیے۔ یہ آرٹ ایسا ہونا چاہیے کہ عوام اُسے سمجھیں اور اُس سے محبت کریں۔ ضروری ہے کہ یہ اُن کے احساسات، خیالات اور عزائم کو متحد کرے اور انھیں بلندی عطا کرے۔

بلاشبہ آرٹ عوام کی ملکیت ہوتا ہے، عوام کے لیے ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اُسے اس کی ضرورت ہے۔ عظیم موسیقی، نفیس رقص، فائن پینٹنگ اور عظیم ڈرامے کو محض چند ''مہذب'' لوگوں کی مسرت کے لیے نہیں رکھنا چاہیے، اسے عوام الناس کو بلا قیمت دینا چاہیے۔ یہ اُن کے لیے اتنا ضروری ہے جتنی کہ ہوا اور روٹی ضروری ہے۔ (1)

سوشلسٹ انقلاب معاشی اور روحانی غلامی کی زنجیریں توڑ کر کلچر پہ استحصالی طبقے کی اجارہ داری ختم کر دیتا ہے اور ساری کلچرل امارت اور علم کو عوام کی ملکیت بنا دیتا ہے۔

آرٹ کو صندوق میں بند کر کے محفوظ نہیں کیا جاسکتا۔ اسے تو عوامی سرگرمی کے چوک پہ رکھا جائے تاکہ وہ لین بھی کر سکے اور دین بھی۔ تبھی آرٹ اور کلچر محفوظ رہ سکتے ہیں۔

اس کا ایک اور مطلب یہ بھی ہے کہ آرٹ کو سیاست سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

نظریہ: مارکسزم، مخالف نظریات کے بیچ کسی کمپرومائز کو تسلیم نہیں کرتا۔ ایک ہی چوائس ہوتی ہے: بورژوا یا سوشلسٹ نظریہ۔ درمیانی راستہ نہیں ہے۔ ایک طبقاتی سوسائٹی میں ایک غیر طبقاتی یا طبقاتی نظریہ سے بالاتر کوئی نظریہ نہیں ہوتا۔ اس لیے سوشلسٹ نظریہ کو کسی بھی طرح کم تر بنانا یا اس سے ذرا سا بھی دور ہٹنا بورژوا نظریہ کو تقویت دینا ہے۔

ریفرنسز

1۔ اِیساڈورا ڈنکن۔ مائی لائف۔ وکٹر گولانز۔ 1968ء۔ لندن۔ صفحہ 158

ہسٹاریکل میٹیریلزم

تاریخ میں فرد کا رول

خود تاریخ کچھ نہیں کرتی۔کوئی بڑی دولت اُس کے قبضے میں نہیں ہے۔ یہ کوئی جنگیں نہیں لڑتی۔تاریخ کچھ نہیں، یہ آدمی ہے جس سے تاریخ بنتی چلتی ہے، اصلی زندہ آدمی یہ سب کچھ کرتا ہے۔آدمی کے پاس دولت ہوتی ہے، آدمی جنگیں لڑتا ہے۔

تاریخ کچھ نہیں ماسوائے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے آدمی کی سرگرمی کے۔مطلب یہ کہ سماجی آدمی سماجی ترقی کا خالق ہے اور اُسے چلانے والا ہے۔

سماج کی تاریخ عوام بناتے ہیں۔

میٹیریل دنیا میں سب کچھ میٹیریل قوانین کے تحت چلتا ہے اور یہ قوانین اٹل ہوتے ہیں۔وہ نہ تو کسی جادوگر کے کرتبوں سے تبدیل ہوسکتے ہیں اور نہ کسی پیر کے دم چُھو سے انھیں بدلا جاسکتا ہے۔ان میٹیریل قوانین میں کسی میر و معتبر اور خان و سردار کی تدبیر اور بہادری کوئی تبدیلی نہیں لاسکتی۔کسی زندہ یا مردہ سینٹ یا سادھو کے مہربان یا غضب ناک ہونے سے ان قوانین کی رفتار اور راستے میں کوئی تغیر برپا نہیں ہوسکتا۔ یہ میٹیریل قوانین لفنگوں، بدعنوانوں، سمگلروں، راسپوٹینوں اور کسی حاضر یا ریٹائرڈ جنرل کے زور سے بھی تبدیل یا ختم نہیں ہو سکتے.....سماج اور کائنات سختی سے قوانین کے تابع ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ تاریخ کا عمومی کاز، اس کی اہم سمت ایک فرد پہ انحصار نہیں کرتے خواہ وہ فرد کتنا بھی زبردست ہو۔نہ ہی سب سے اہم شخصیت ہسٹری کی عمومی سمت کو تبدیل کرسکتی ہے۔

انسان بھی ان ہی اٹل قوانین کا پابند ہے۔نہ ایک انچ اِدھر نہ ایک انچ اُدھر۔بس اُسی چوکھاٹ میں رہتے ہوئے اور ان ہی قوانین کو استعمال کرتے ہوئے اپنے اشرف المخلوقاتی مظاہر کو نکھارتے رہنا ہے۔

ہسٹارکل میٹریلزم کا مطلب ہے: ڈائیلیک ٹیکل میٹریلزم کے اصولوں کو سماج کی تاریخ کے سمجھنے کا آلہ بنایا جائے۔یعنی جب ڈائلیک ٹکل میٹریلزم کو انسان اور انسانی سماج پر لاگو کیا گیا تو

اسے ہسٹارک میٹیریلزم کا نام دیا گیا۔ ڈائلیک ٹکل میٹیریلزم اور ہسٹاری کل میٹریلزم ایک اٹوٹ مجموعہ ہے۔ بہ یک وقت ایک کی غیر موجودگی اور دوسرے کی موجودگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ہم زندگی گزارنے یعنی پیٹ بھرنے، لباس تیار کرنے اور رہائش کا انتظام کرنے کے لیے اوزار استعمال کرتے ہیں۔ یہ اوزار ایک پتھر بھی ہوسکتا ہے، ایک کلہاڑی بھی، پیچ کس بھی، دیوہیکل مشین بھی اور کمپیوٹر چپ بھی۔ ان اوزاروں کو ''آلاتِ پیداوار'' کہتے ہیں۔

لیکن یہ اوزار از خود پیداوار نہیں کرسکتے۔ انھیں آپ کسی چیز پہ استعمال کر کے ہی اپنی ضروریات حاصل کرسکتے ہیں۔ ہماری ضروریاتِ زندگی پیدا کرنے کے لیے جس چیز پہ یہ اوزار استعمال ہورہے ہوتے ہیں، اُس چیز کو ''ذرائع پیداوار'' کہتے ہیں۔ مثلاً زمین یا فیکٹری۔ انسانی محنت اور آلات باپ ہیں اور زمین یا فیکٹری ماں ہے۔

اب ''آلاتِ پیدا وار اور ذرائع پیدا وار'' جمع ہوتے ہیں تو ہم اسے ''مینز آف پروڈکشن'' کہتے ہیں۔

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ آلاتِ پیداوار خواہ فرسودہ تھے یا ترقی یافتہ، انھیں استعمال کرنے والا تو انسان تھا۔ وہ رفتہ رفتہ اپنے تجربوں کو بروئے کار لاتا رہا اور اِن آلاتِ پیداوار کو ترقی دیتا رہا تا کہ مشقت بھی کم ہو اور پیداوار بھی زیادہ ملے۔ اِسے ہنر یا علم یا ٹکنالوجی کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ علم کا سرچشمہ آلات پیداوار ہے۔ یہی ہنر، یہی سائنس اور یہی ٹکنالوجی شعور کی بنیاد ہے۔

یہ ترقی یافتہ آلات پیداوار اور اُسے استعمال کرنے والا شعور یافتہ محنت کش آدمی مل کر ''پیداواری قوتیں'' یا ''پراڈکٹو فورسز'' بناتے ہیں۔

ضروریات کو پیدا کرنے کے دوران لوگ آپس میں کسی بندھن میں ہوتے ہیں۔ اس بندھن کو، اِس ریلیشن شپ کو پیداواری رشتے یا ریلیشنز آف پروڈکشن کہتے ہیں۔ یہ دراصل سماج ہی ہوتا ہے جس میں منظّم ہوکر انسان پیداوار کرتا ہے۔

اور اوپر کی ساری چیزوں کو ملا کر اس سارے مجموعے کو ''Methods آف پروڈکشن'' (طریق پیداوار) کہتے ہیں۔

پیداواری رشتے اگر پیداواری قوتوں (محنت کش اور آلاتِ محنت) کی مطابقت میں ہوں تو زبردست ترقی ہوتی ہے۔ یہ تعلقات فیوڈل ازم میں مختلف تھے۔ وہاں سے آلاتِ محنت کی ترقی کے ساتھ ساتھ محنت کش بھی ترقی کرتا گیا۔ نتیجہ یہ کہ فیوڈل پیداواری رشتے بالآخر ترقی میں رکاوٹ بن گئے لہٰذا اُن کا ٹوٹنا ضروری ہوگیا تھا۔

ملکیت کی صورت دراصل پیداواری رشتوں کا تعین کرتی ہے۔ اگر ملکیت عوام کی مشترکہ ہے تو پیداواری رشتے استحصال سے آزاد انسانوں کے بیچ تعاون اور باہمی مدد کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اگر ملکیت ذاتی، نجی یا پرائیویٹ ہے تو پیداواری رشتے غالب و مغلوب والے ہوجاتے ہیں۔ غالب، مغلوب کو مغلوب ہی رکھنے کی تدابیر کرتا رہے گا اور مغلوب اپنی مغلوبیت سے آزادی حاصل کرنے کے لیے غالب کو نیست و نابود کرنے تک کی جدوجہد کرتا رہے گا۔

پیداوار کی ایک خاصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ جامد نہیں رہتی بل کہ بڑھتی اور بہتر ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے کہ انسان ایسا کرنا چاہتا ہے اور ایسا کرتا ہے۔ انسان اس لیے ایسا کرتا ہے کہ اس کی ضروریات بڑھ رہی ہوتی ہیں۔ چناں چہ پیداوار کی بڑھوتری اور بہتری ایک معروضی ضرورت ہے، ایک قانون ہے۔

مگر یہاں صورت حال ایک دلچسپ موڑ مڑتی ہے۔ پرانے پیداواری رشتوں اور ترقی یافتہ آلات و انسان کے بیچ ایک تضاد سا پیدا ہونا شروع ہوجاتا ہے، بڑھتے بڑھتے یہ پیداواری قوتیں اپنے گرد موجود فرسودہ شدہ پیداواری رشتوں کی پابندیاں، حدود اور چوکھاٹ سے نباہ کرنے سے قاصر ہوجاتی ہیں اور پھر وہ انھیں توڑ ڈالتی ہیں اور اپنے لیے ایک نیا اور ارتقا یافتہ پیداواری رشتے بناتے ہیں۔

اس سارے ارتقائی سفر میں انسان مختلف مدارج سے گزرا۔ سارا ارتقا آلاتِ پیداوار، انسانی مہارت یافتہ، اور باریکی سے کام کرنے والی انگلیوں بازوؤں اور اِن دونوں سے اخذ کردہ ہنر سے وجود میں آتا رہا۔ یعنی بنیاد مَیٹر ہے، آلات ہیں۔ نہ کہ شعور و عقل و آئیڈیا ہے۔ شعور تو خود مَیٹر کی ایک خصوصیت ہے، اس لیے کہ وہ مَیٹر ہی سے جنم لیتا ہے۔ ہم ایک لفظ ''سماج کا شعور'' استعمال کرتے ہیں یعنی کلچر، فلسفہ، قانون، آرٹ، مذہب، رسوم و رواج۔ تو یہ سماج کا شعور بھی سماج

کے اندر سے جنم لیتا ہے، سماجی میٹریل حالات سے یعنی موڈ آف پروڈکشن سے۔

اب تک کا انسانی سماج چار موڈز آف پروڈکشن سے گزرا ہے:

1۔قدیم کمیونزم

جب انسان جانور جیسا تھا اور ترقی یافتہ نہ تھا، تب وہ پھل وغیرہ چُن کر گزارہ کرتا تھا۔ اُس دور کو ''چُننے والا'' یا ''گیدررسماج'' کہتے ہیں۔ساتھ میں وہ فریب دے کر یا کبھی کبھی پتھر ڈنڈا استعمال کر کے جانوروں کا شکار کرتا تھا: ''ہنٹرز سماج''۔بعد میں وہ شکار میں تیر کمان اور نیزہ بھی استعمال کرنے لگا۔اُس دور میں جنگلی بیر اور دوسرے میوہ دار جنگلی درخت کسی کی ملکیت نہیں ہوا کرتے تھے۔اسی طرح نہ تو پتھر اور ڈنڈا (آلاتِ پیداوار) کسی کی ذاتی ملکیت تھا اور نہ فطرت میں آوارہ پھرنے والا شکار کا جانور کسی کے جھوک کا مویشی تھا۔محنت مشترک تھی اور پیداوار (شکار) بھی مشترک۔اس لیے اسے قدیم کمیونزم کا سماج بھی کہتے ہیں۔ ہزاروں برس تک انسان اسی سماج میں رہتا رہا۔

جب موڈ آف پروڈکشن گیدرر یا ہنٹرز (قدیم کمیونزم) والا تھا تو اس سماج میں نہ ریاست موجود تھی، نہ قوم وجود میں آئی تھی اور نہ کوئی منظّم عقیدہ موجود تھا۔ظاہر ہے کوئی فلسفہ، نظریہ اور تحریر ایجاد نہ ہوئی تھی اور نہ خاندان کا ادارہ موجود تھا۔قصور دماغ اور شعور کا نہ تھا بل کہ یہ سماج کے میٹیریل حالات تھے جنھیں اُس وقت نہ ریاست کی ضرورت تھی، نہ اکاؤنٹ بک کھولنے کی حاجت تھی اور نہ شجرۂ نسب کے لیے خاندان والے ادارے کی ضرورت تھی۔

سبط حسن اپنی کتاب ''ماضی کے مزار'' میں بہت اہمیت والی بات کرتا ہے: ''خضری دور کے آغاز پر قبیلے کی وحدت تو بدستور برقرار رہی بل کہ اور زیادہ مضبوط ہوگئی۔ البتہ قبیلے کے اندر عورت کی حیثیت ضمنی ہوگئی۔ یہ جنگلی جانوروں کے شکار کا دور تھا۔کیوں کہ اب انسان پتھر کے نوکیلے ٹکڑوں کو لکڑی سے جوڑ کر کلہاڑے اور بھالے بنانے لگا تھا۔جنگلی جانوروں کا شکار بڑے جان جوکھم کا کام تھا۔اس میں جسمانی طاقت زیادہ درکار ہوتی تھی لہٰذا یہ کام مردوں کے سپرد ہوا۔دراصل اسی وقت سے معاشرے میں تقسیمِ کار کی بنیاد پڑی۔''

2۔غلام داری سماج

رفتہ رفتہ اُس خاص جغرافیائی علاقے میں آبادی بڑھتی گئی، شکار کم پڑتا گیا اور اس کا حصول مشکل بنتا گیا۔تب ایک شکاری قبیلے نے دوسرے شکاری گروہ کو قتل کر کے اُس کا شکار چھین لیا۔مگر اجتماعی تجربے کر کر کے آگے چل کر انھیں احساس ہوا کہ مغلوب گروہ کے آدمیوں کو بے فائدہ قتل نہیں کرنا چاہیے بل کہ انھیں قتل کرنے کے بجائے اُن کو اپنا غلام بنایا جائے تاکہ وہ اُن کے لیے جا کر شکار کر لائیں۔ یہ ہے غلام دارانہ سماج۔

یہاں آقا غلاموں کا استحصال کرتے تھے۔ وہ غلاموں کی محنت کی پیداوار کو اپنی ذاتی عیاشی میں صرف کرتے تھے۔ وہ غلاموں سے شکار کرواتے تھے، ہل چلواتے تھے اور جنگوں میں لڑواتے تھے۔اس عہد میں چین، ہندوستان، مصر، اٹلی، یونان، روم اور وسط ایشیا میں غلاموں سے نہریں، سڑکیں، پُل، قلعے اور محل تعمیر ہوتے رہے۔اس کے علاوہ کان کنی میں غلام جھونکے جاتے رہے۔لوہا، سونا اور چاندی کی کانوں میں غلام ہی کام کرتے تھے۔ غلام سونا چاندی کھودتے اور آقاؤں کے لیے عظیم الشان محلات تعمیر کرتے۔ وہ قلعے اور مندر بناتے۔اہرامِ مصران ہی غلاموں کی محنت کا نتیجہ ہیں۔روم کی سپر پاوری اسی غلام داری کی بہ دولت تھی۔

غلاموں کی محنت سے پیدا شدہ عظیم پیداوار کا معمولی حصہ ذرائع پیداوار کی ترقی کے لیے خرچ کیا جاتا تھا مگر اس عہد میں تباہ کن جنگوں کے نتیجے میں پیداواری قوتیں بار بار تباہ ہوتیں، شہر اور بستیاں اجڑ جاتیں۔قدیم یونان ایسی جنگوں کی تاریخ سے بھرا پڑا ہے۔روم امپائر کی تاریخ کا بھی یہی حال ہے۔

بس ایک کام بڑھتا گیا: غلاموں کی خرید و فروخت ترقی کرتی گئی بل کہ اب کچھ خاص مفتوحہ علاقے غلام حاصل کرنے کا مستقل ذریعہ بنا دیے گئے۔ غلاموں کی تجارت کی بڑی بڑی منڈیاں قائم ہوئیں۔

ریاست، فلسفہ، دھرم، خاندان، اور تحریر تو بہت بعد میں جا کر، سرف ڈم کے زمانے میں نمودار ہوئے۔اس لیے کہ اب مویشیوں کی تعداد جیسی چیزوں کا ریکارڈ رکھنے کی ضرورت پڑی۔

یہیں غلام داری سماج ہی میں یہودیت والا مذہب پیدا ہوا۔ جس میں عوام الناس کو صبر و قناعت اور عدم تشدد کی تلقین کی جاتی تھی۔ اچھا غلام بننے کی ہدایت۔ آقا اور غلام کا دور، بادشاہ اور رعیت کا دور، اور محتاج اور مخیّر کا دور۔

3۔ فیوڈلزم

زمان کی بیکراں وسعتوں میں انسان، بالخصوص عورت نے کاشت کاری دریافت کی۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ اگر پھل یا بیج زمین میں دھنس جائے یا ڈالی جائے تو پھل یا فصل حاصل ہو سکتی ہے۔ نتیجے میں پندرہ بیس ہزار سال قبل بڑے پیمانے کی کاشت کاری وجود میں آئی اور سماج بڑھتے بڑھتے فیوڈلزم والا بن گیا۔

اس لیے کہ انسان رفتہ رفتہ جنگلات صاف کر کے قابلِ کاشت زمین کو وسیع بناتا گیا اور پھر اُس کی ملکیت بھی چند لوگوں کے ہاتھ آئی۔ یوں زمین اور آلاتِ پیداوار نجی ملکیت میں جاتے گئے۔ اس کے علاوہ اب انسان پتھر کے آلاتِ پیداوار کی جگہ دھات کے آلات بنانے لگا تھا اور پھر مہر گڑھ میں پہیہ بن گیا۔ یوں اُس کی قوتِ محنت بہت بڑھ گئی۔ دھونکنی کی ایجاد نے لوہار کو اس قابل بنا دیا کہ وہ لوہے کے مضبوط اوزار بنا لے۔ لوہے کی کلہاڑی انسان کے ہاتھ میں ایسا ہتھیار آ گیا جس سے وہ جنگلوں کو صاف کرنے کے قابل ہو گیا اور لوہے کے پھالے کی مدد سے لکڑی والے ہل کے مقابلے میں زیادہ بڑی زمین کے قطعات کو زیرِ کاشت لایا۔ اس نے اب جنگلی جانوروں کے شکار سے خوراک حاصل کرنے کا کام چھوڑ کر بڑے پیمانے کی کاشت کاری اختیار کی۔

ساتھ میں وہ مویشی بھی پالنے لگا۔ یوں اُس کی زرعی پیداوار بڑھی۔ اس نے اب فصلوں کی ورائٹی بھی بڑھا دی۔

اب باقاعدہ دو طبقے بن گئے: زمین کا مالک طبقہ اور بے زمین کسان طبقہ۔ مالک نے کسان کو قابو میں رکھنے کے لیے ڈنڈے مار قسم کے لوگ رکھے۔ کوئی جادوگر، نجومی، دم چُھو کرنے والا پکڑ کر دربار میں بٹھا دیا۔ ایک آدھ شاعر اور ایک آدھ قاضی بھرتی کیا۔ کچھ اور شعبوں میں بھی اس نے کرائے کے آدمی رکھے۔ یہیں سے ریاست کا آغاز ہوا۔

دولت مند جاگیردار مزید دولت مند ہونے لگا۔ اس کے مویشیوں کے ریوڑ بڑھنے لگے۔ ساتھ میں کپڑا بُننے اور دھات کے آلات بنانے کا فن بھی ترقی کرتا رہا۔

ارتقا اور ترقی ہوتی گئی۔ سرف ڈم تو اس لیے تھا کہ آلاتِ پیداوار فرسودہ تھے۔ آلات میں ترقی ہوئی تو کسان کا درجہ بھی بلند ہوا۔ سرف ڈم ختم ہوئی اور کسان فروخت ہونے سے آزاد ہوا۔ وہ رہا تو کسان ہی مگر اب مالک چُننے کی اُسے آزادی ملی۔

فیوڈل ازم کا غالب مذہب مسیحیت تھا۔ چرچ، پوپ، بادشاہ اور جاگیردار کی اطاعت اس مذہب کا خاص پیغام تھا۔ شیولری، غیرت و آنر، اور وفاداری یہاں ویلیوز کے بہ طور راسخ ہوئے۔

Medieval (5ویں سے 15ویں صدی تک) کا یہ زمانہ یورپ میں تاریک ترین دور رہا ہے۔ اس میں فرد کو کوئی آزادی نہیں تھی۔ سماج چرچ، بادشاہ اور فیوڈل لارڈز کے چنگل میں پھنسا ہوا تھا۔ معاشرہ سماجی، مذہبی اور سیاسی پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ تخلیقی عمل رک چکا تھا۔ یورپ معاشی طور پر خستہ حال تھا۔ مسیحیت یعنی چرچ اور پادری، عوام کو ریاست کے ظلم کو صبر سے برداشت کرنا سکھاتی تھی۔ مسیحیت سے علیحدہ ہر مذہب اور رویہ کو طاقت کے زور پہ دبایا گیا۔ اس مشن کے تحت چرچ نے پورے یورپ سے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو زبردستی مسیحی بنانا شروع کیا اور جو نہیں مانتے انھیں یا تو قتل کیا، زندہ جلا دیا یا جلاوطن کر دیا۔

عورتوں کے ساتھ اس سے بھی خطرناک رویہ اپنایا گیا۔ پادریوں نے عورتوں کی زیب و زینت و آرائش پہ حملہ کر دیا۔ عورت کا جسم اور اس کا لباس ان کے وعظوں کا اہم موضوع بن گیا، عورت کو جنسی اعضا کے طور پر حقارت کی نگاہ سے پیش کیا گیا۔ سمجھ دار اور چرچ کی بدعنوانیوں کے خلاف بولنے والی عورتوں (آوازوں) کو ڈائن اور شیطان کا ساتھی یا پھر گم راہ قرار دیا۔

کنفیشن کے عمل کے ذریعے چرچ کی طرف سے افراد کی نجی زندگی میں مداخلت شروع ہو گئی تھی اور ہر مسیحی کے لیے یہ ضروری ٹھہرا کہ کم از کم سال میں ایک مرتبہ اپنے علاقے کے پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرے۔ اس اعترافات کے نتیجے میں پادری نے افراد کے اُن معاملات میں بھی دخل دینا شروع کیا جو بہت زیادہ نجی تھے۔ اب چرچ سیاسی طور پر اتنا مضبوط ہوا

تھا کہ بادشاہ کی تاج پوشی کی رسم بھی چرچ میں ادا ہوتی تھی۔

چرچ نے اپنے مذہبی اور سیاسی تسلط کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کو دبانے کے لیے انکویزیشن کا محکمہ بنایا تا کہ منحرفین جو چرچ اور ریاست کے لیے خطرہ ہوں، انھیں سزا دی جائے۔ ان سزاؤں میں اذیت دینا، جلا وطن کرنا، جائیداد ضبط کرنا، زندہ جلانا اور موت کی سزا شامل تھی۔ انکیوزیشن ادارے کا کام یہ تھا کہ ریاست اور چرچ کی بدعنوانیوں اور غلط پالیسیوں کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کو دبائے اور آگاہی کو روکے۔

جب جرمنی میں پرنٹنگ پریس مشین ایجاد ہوئی تو یہ گویا دنیا کی تاریخ میں ایک انقلاب تھا۔تب کتابیں زیادہ چھپنے لگیں لوگ زیادہ پڑھنے لگے۔ بائبل کا بھی مقامی زبانوں میں ترجمہ ہونے لگا۔اب لوگوں کو بائبل سمجھنے کے لیے چرچ کے کسی پادری کا محتاج نہیں بننا پڑتا۔اس طرح یورپ میں ترسیلِ علم تیز ہوگئی۔ چرچ کے خلاف جب آوازیں اٹھنے لگیں تو 1530ء میں انکوزیشن نے اپنے دائرۂ عمل میں دانش وروں اور تعلیمی درس گاہوں کو بھی لے لیا۔ یونی ورسٹی کی تعلیم، نصاب کی کتابیں اور پروفیسروں کے خیالات کی نگرانی ہونے لگی۔ یونی ورسٹی میں لیکچر ہال کے برابر والے کمرے میں انکوزیشن کا عہدے دار پروفیسر کا لیکچر سنتا تھا تا کہ پروفیسر ایسے خیالات کا اظہار نہ کرے جو چرچ کی تعلیمات کے خلاف ہوں۔ پرتگال کے طالب علموں کو تعلیم کے لیے دوسرے ملکوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔کوپرنیکس، گلیلیو، نیوٹن اور کئی دوسرے ریسرچرز کی کتابیں ممنوع تھیں۔کتابوں کی اشاعت سے پہلے چرچ کے عہدے دار اس کی چھان بین کرتے، چرچ کی اجازت کے بغیر کوئی کتاب، میگزین یا تحریر نہیں چھپ سکتی تھی۔

چرچ اور ریاست کے اس قدر گھٹن زدہ ماحول میں لوگوں کا سانس لینا مشکل ہوگیا تھا۔ لوگ تنگ آ چکے تھے۔

4۔کیپٹلزم

یہ سب وہ محرکات تھے جنھوں نے ''رینے ساں'' کو جنم دیا۔رینے ساں وہ زمانہ تھا جب چرچ اور ریاست کی بربریت کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں۔ اصلاحی اور ہیومنسٹ تحریکیں شروع

ہوئیں اور آہستہ آہستہ روشن خیالی اور فرد کی آزادی کے حق میں آوازیں تیز ہونے لگیں۔ بغاوت کی یہ تیز وطرار آواز پورے یورپ میں گونجنے لگی اور فرانس میں انقلاب کے بعد یورپ کی دوسری ریاستوں نے دباؤ میں آ کر ہیومنسٹ تحریکوں اور اصلاحات کو تسلیم کیا۔اس طرح لوگوں کو چرچ اور بادشاہ کے ظلم وستم سے آزادی ملی۔۔بادشاہ اور چرچ کا تسلط ختم ہوا، فرد کی آزادی بحال ہوئی۔اب لوگوں کا رجحان معیشت پر ہوا۔اس کے لیے انھوں نے مختلف راستہ ڈھونڈنا شروع کیا۔

دراصل فیوڈلزم ہی کے دوران ترقی یافتہ آلات کے لیے دست کاروں کا اپنا گروہ، ورکشاپ اور دیہی مارکیٹ وجود میں آتی گئی۔ یوں شہر اور دیہات کا تصور سامنے آیا۔یعنی اب دست کاری اور زراعت کی علیحدہ علیحدہ نشوونما ہونے لگی۔اس تقسیم کے نتیجے میں تبادلے کے لیے پیداوار کی جانے لگی۔یعنی اب اشیا ذاتی استعمال کے ساتھ ساتھ تبادلے کے لیے بنائی جانی لگیں۔اب سرکاری واجبات کی ادائیگی کے لیے بھی اجناسِ پیداوار کا ایک حصہ منڈی میں لے جانا پڑتا تھا۔

آلاتِ پیداوار ہاتھ سے بنانے کے بجائے اوزاروں (مشینوں) سے بننے لگے تو دست کاروں کی ورکشاپوں کی جگہ انڈسٹری نے لے لی۔ یہی انڈسٹری دراصل فیوڈلزم کے خاتمے کا آغاز بھی تھی۔اس لیے کہ اب انڈسٹری خود سے ایک حقیقت بنتی گئی۔

لیکن جاگیرداری سماج خود بہ خود یعنی آٹو میٹک انداز میں انڈسٹری میں تبدیل نہیں ہوئی بل کہ اس کے لیے انڈسٹری والے علاقوں، یعنی شہروں نے فیوڈلزم کو زور زبردستی سے پچھاڑ دیا۔ انڈسٹریل انقلاب لاکر اور بڑے پیمانے کی کشت وخون سے گزر کر ہی ایسا ہوا۔ یہ کام صنعتی یورپ میں ہوا۔ یہ انقلابات اس لیے ضروری تھے کہ ترقی یافتہ آلاتِ پیداوار اب اس سماج میں سما نہیں سکتے تھے۔اب چوں کہ کسان اور جاگیردار کے بجائے صنعت کار اور مزدور ایک الگ موڈ آف پروڈکشن (طریقِ پیداوار) بن چکے تھے۔اس لیے آخری ہلّہ بولنا ہی تھا۔

صنعتی انقلاب کا سیٹی بجانے والا ملک انگلینڈ تھا۔صنعتی انقلاب کا سب کچھ وہیں ہو رہا تھا۔یعنی 18ویں صدی کے وسط تک برطانیہ سب سے بڑی کمرشل قوم تھی۔ گلوبل ٹریڈنگ امپائر انگلینڈ کیپٹلزم کی جنم بھومی ہے۔

انیسویں صدی سے قبل ہمارا پورا معاشرہ فیوڈل اور ماقبل فیوڈل سماجی رشتوں میں تھا۔
اسی طویل فیوڈلزم کے دوران:

1۔ دست کاریاں ترقی کرنے لگیں۔ دست کاری نے قصبے بنائے۔ یہ قصبے غلام داری میں بنے۔ یہ قصبہ ہوتے ہوتے دیہات سے الگ ہوگیا۔ پن چکی، لوہے کے استعمال اور کپڑا بُننے میں ترقی نے مل کر شہری آبادی کی بنیادیں رکھی تھیں۔ دست کاریاں بھی وہیں مرکوز ہوئیں اور تجارت بھی۔

2۔ اسی طرح زراعت میں ترقی ہوتی رہی۔ نئے پھل اور اناج ایجاد ہوتے گئے اور جانوروں کو سدھا کر بار برداری اور ٹرانسپورٹ کے بہ طور استعمال کیا جاتا رہا۔

3۔ اسی اثنا میں یورپ میں 16 ویں سے 18 ویں صدی تک ٹکسٹائل انڈسٹری نے ایک ایسا نظام تشکیل دیا جس میں پیداواریت بڑھانے کے لیے جمع شدہ کیپٹل کی سرمایہ کاری کی گئی۔ اسے کیپٹلزم کہتے ہیں۔ یعنی جو نیا صنعتی نظام پیداوار بنا، اس کو کیپٹلزم کہتے ہیں۔

1750ء سے لے کر 1850ء تک کے برطانوی انڈسٹریل ریولیوشن میں دنیا عجب انداز میں تبدیل ہوتی رہی۔ وہاں انڈسٹریل ریولیوشن کی نمایاں ترین چیز یہ تھی کہ دست کاروں کی کارگاہوں کی جگہ اب مشینیں لینے لگیں۔ انڈسٹری میں لیبر کی تعداد بڑھتی گئی، کیپٹل انوسٹ منٹ ہوتا رہا، پیداوار ہاتھ کے بجائے مشین کے استعمال کی بہ دولت بہت ہونے لگی۔ ٹکسٹائل انڈسٹری سب سے زیادہ منافع بخش ہوتی گئی۔ پانی کی اپنی قوت اور اُس سے بنائی جانے والی بھاپ کی طاقت کو صنعت میں استعمال کیا جانے لگا، اب ایسی بڑی فیکٹریاں بننے لگیں جو مشینیں تیار کرتی تھیں۔ اسی طرح انڈسٹریل ریوولیوشن میں نہری نظام نے زراعت کی بارانی اور فرسودہ طرز ہائے آب پاشی پہ حاوی ہونا شروع کیا، زراعت میں کیمیکل اشیا کا استعمال بڑھتا گیا، لوہے کا استعمال بڑھتا گیا۔ سمندروں میں بھاپ سے چلنے والے جہاز، مال لانے لے جانے لگے، مست توکلی کو حیران کر دینے والا ریل وے قائم ہوکر بلوچستان تک آیا اور اطلاعات کے لیے ٹیلی گراف آیا۔

شہر، بلا کی طرح ابھرنے لگے، دیہات شہر کے پیٹ میں بھی جاتا رہا اور شہر کا پیٹ بھرتا بھی رہا۔ بکھری آبادی مرتکز ہونے لگی۔

یوں، اِن تینوں مظاہر نے مل کر بلوچستان سمیت دنیا بھر میں فیوڈل ازم کو بالآخر کہیں مکمل طور پر اور کہیں جزوی طور پر توڑ دیا اور کیپٹلزم اس کی جگہ گھیرنے لگا۔ یوں، داخلی طور پر یہاں وہاں کچھ سرداریاں وڈیرہ گیریاں رہ گئی ہوں گی مگر مجموعی طور پر فیوڈل اور ماقبل فیوڈل سماج ''زَربُرد'' ہوکر عالمی کیپٹلزم کی ٹرین کے ساتھ اپنی بوگی لگا چکا۔

مطلب یہ کہ انسان بیر چُننے اور بعد میں زراعتی معاشرے سے ہوتے ہوئے دھاتوں کے استعمال سے تاجر اور دست کاروں میں بدل کر، پھر سٹیم انجن اور موٹر کے استعمال سے بہ زورِ قوت فیوڈلزم اور بادشاہت ختم کر کے حال ہی میں کیپٹلزم میں داخل ہونے کی ہزاروں برسوں کی تاریخ رکھتا ہے۔

مندرجہ بالا ایک فقرے سے ہی اندازہ ہونا چاہیے کہ باہر سے نہیں سب کچھ سماج کے اندر سے جنم لیتا رہا۔ ایک نفی جس نے بلوغت پہ اپنے پورے فریم ورک کو نفی میں بدل ڈالا مگر بہ یک وقت اپنی کھوکھ میں اپنی ہی نفی کے نطفے کو پالنے بھی لگی۔ یہ جو نطفہ ہے، یہ دراصل پیداوار کے ٹولز ہیں جو جوان ہوتے ہیں تو اپنے فریم یعنی پیداواری رشتوں کو تتر بتر کر دیتے ہیں اور اپنی مطابقت میں نئے پیداواری رشتے قائم کرتے ہیں۔ آج ہم ترقی یافتہ کیپٹلزم نامی پیداواری رشتوں میں زندہ ہیں۔

چوں کہ مشینوں سے واسطہ تھا، اس لیے تعلیم (ٹیکنیکل تعلیم) مشین پر کام کرنے والے ہر مزدور کے لیے ضروری ہوگئی۔ اسی لیے جگہ جگہ ایسے سکول، کالج اور ٹریننگ سنٹرز سرکاری طور پر کھول دیے گئے۔

''پیسہ کیپٹل اُس وقت بنتا ہے جب اس کی مدد سے دوسرے یا دوسروں کی قوتِ محنت خریدی جائے۔'' اور جن لوگوں کے پاس کیپٹل ہوتا ہے انھیں کیپٹلسٹ کہا جاتا ہے۔ جب بھی قوتِ محنت بہ طور کماڈٹی بکے تو سمجھو کیپٹلزم ہے۔ اس میں مزدور کو معاوضہ بس اتنا ملتا ہے جس سے وہ خوراک، پوشاک اور دوسری انتہائی بنیادی چیزیں خرید سکتا ہے۔ لیکن اپنے اس بیچے ہوئے وقت سے وہ جو اشیا پیدا کرتا ہے اس کی قیمت مزدور کے معاوضے سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ان دونوں کا فرق ''سرپلس ویلیو'' کہلاتا ہے۔

تو، کپٹلزم کیا ہے؟ یہ سرپلس ویلیو پیدا کرنے والا نظام ہے۔

معاشیات کا علم کب آسان رہا ہے۔ جاگیردار کی منشی گیری، اکاونٹس برانچ کی کلرکی، ضرب تفریق، پہاڑے، کلیے، بیجک، ورداس، قلم، بہی کھاتہ، رجسٹر...... پھر جوں جوں سماج آگے بڑھتا گیا تو کیلکولیٹر، اعداد و شمار، کمپیوٹر، رپورٹس، محکمہ معاشیات...... اور اب آئی ایم ایف، ڈبلیو ٹی او، ورلڈ بینک، گلوبلائزیشن، فری مارکیٹ، مارکیٹ فورسز...... اتنا گنجلک شعبہ، اتنی پیچیدہ سائنس، اس قدر خوف ناک کام...... اور صاحبِ علم کی انگلیاں، مونچھیں سگریٹ کے دھوئیں سے زردی مائل زنگ سے رنگے ہوئے، شیو بڑھی ہوئی، بال الجھے ہوئے یا پھر بے پناہ گنجا پن...... کس قدر خوف ناک شعبہ ہے یہ۔

مگر اسی خوف ناک شعبے میں تو 95 فی صد انسانوں کی غریبی کے منتر گھڑے جاتے ہیں، لکھے جاتے ہیں_ ان ہی ضخیم رپورٹوں میں تو ''معمولی سی انویسٹ منٹ کے'' غیر معمولی منافع کے گنڈے اور تعویذ لکھے جاتے ہیں_ یہی بہی کھاتے تو قافلہ گیری کے ساج سے لے کر ترقی یافتہ کپٹلزم تک انبوہِ عظیم کی تقدیروں پہ سیاہی پھیرتے رہتے ہیں...... ان مٹ، دیرپا ابدی سیاہی۔

مگر ساتھ میں یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ پچھلے سارے نظاموں کے مقابلے میں کپٹلزم پروگریسو ہے۔ اس لیے کہ یہ پرانے طریقِ پیداوار کو تباہ کرتا ہے اور پیداواری قوتوں کو ترقی دیتا ہے۔ کپٹلسٹ کلاس کے قبضے میں وسائلِ پیداوار یعنی مشینیں فیکٹریوں کی صورت میں ہیں۔ اب مال کی یہ پیداوار خود پہ استعمال کرنے کی بجائے مارکیٹ میں ایکس چینج کے لیے ہوتی ہے۔

یہ خاصیت اس کے استحصال کو گلوبل اور لامحدود بناتی ہے۔ یہ معیارِ زندگی بلند کرنے کی تلاش میں ہوتا ہے۔ اس طرح وہ زیادہ سامان فروخت کرسکتا ہے۔ یہ فری مارکیٹ کو بڑھاوا دینے کے لیے ڈیموکریسی کی مدد کرتا ہے۔

کپٹلزم مزدوروں کو ترقی دیتا ہے، منظّم کرتا ہے۔ مگر یہ ترقی کرتے کرتے ایک سٹیج پہ جا کر مزدوروں کو محکوم بناتا ہے اور غربت اور سٹرانڈ کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ پیداواری قوتوں کی نشوونما کو روک دیتا ہے اور اس سٹیج پر پہنچ کر مزدور سرمایہ دار کے دشمن بن جاتے ہیں۔

کماڈٹی

جو پراڈکٹ ڈائریکٹ کھپت کے لیے نہیں بل کہ تبادلے کے لیے، یعنی مارکیٹ میں فروخت کرنے کے لیے تیار کی جائے اُس کو ''کماڈٹی'' کہتے ہیں۔ دنیا میں دست کاری اولین کماڈٹی تھی۔ ہر کماڈٹی کی ایک نہیں دو قیمتیں (ویلیوز) ہوتی ہیں۔ یا تو آپ اسے خود استعمال کرتے ہیں (یوز ویلیو)، یا پھر جا کر ''اُسے'' دے دیتے ہیں اور بدلے میں ''اُس سے'' اپنی ضرورت کی دوسری چیز لے آتے ہیں۔ (ایکسچینج ویلیو)۔

یوز ویلیو کو ذرا قیلولہ کرنے دیں اور آیئے دیکھتے ہیں کہ یہ ایکسچینج ویلیو کو کون، کس طرح مقرر کرتا ہے۔

ایکسچینج ویلیو کو اُس کماڈٹی کی تیاری پر لگی ہوئی انسانی محنت مقرر کرتی ہے۔ یعنی آپ چھ گھنٹے لگا کر تیار کردہ اپنی کماڈٹی کو اپنی ضرورت کی اُسی کماڈٹی سے بغیر اضافی کچھ دیے ہوئے، تبدیل کرسکیں گے جس کی تیاری میں اگلے نے بھی چھ ہی گھنٹے صرف کیے ہوں۔ اس نظام کو بارٹر سسٹم کہتے تھے۔ بلوچی میں ''مٹ سٹ''۔ یہ نظام بہت زمانوں تک چلا اور کماڈٹیز کا یہ توسیع شدہ ایکسچینج عام بن گیا تو ''کرنسی'' ابھری۔ کرنسی ایک یونی ورسل کماڈٹی ہے جس سے باقی ساری کماڈٹیز کو جانچا جاتا ہے۔ یعنی کرنسی، کماڈٹیز کے ایکسچینج کے اندر ایک بیچ والے عامل کا کام دیتی ہے۔ اب ہر کماڈٹی کی قیمت کرنسی میں طے ہوتی ہے۔

پیچیدہ بات تو پیچیدہ رہتی ہی ہے۔ آپ کو لتا منگیشکر کے کسی مست گانے میں بھی لپیٹ کر سنا دیے جائیں تب بھی اگلے دو پیراگراف سادہ نہیں بن سکتے۔ اس لیے دماغ کے آستین چڑھایئے اور پڑھنا شروع کیجیے:

ایک کارخانہ دار مارکیٹ میں روزانہ 500 روپے گز کے حساب سے کپڑا بیچتا ہے۔ اس میں سے وہ مزدور کو دن کے چھ گھنٹے کام کرنے کے اجرت کے بہ طور 100 روپے دیتا ہے۔ وہ اس کپڑے کا خام مال خریدنے میں 50 روپے مزید خرچ کرتا ہے۔ یہ بھی شامل کیجیے۔ خرچہ بنے گا

150 روپے۔اب مشین کی قیمت، مرمت، ایندھن وغیرہ کا خرچہ 50 روپے ملالیں تو اب یہ سارا ہوگیا 100+50+50= 200 روپے ۔یعنی 200 روپے آ گیا خرچہ ۔ اب مالک یہ کپڑا 500 روپے کا بیچے گا۔یعنی 300 روپیہ منافع۔

ذرا گڑبڑ دیکھیے ۔دراصل مزدور نے اپنے 100 روپوں جتنا کام چھے گھنٹے میں نہیں کیا تھا۔اس نے اپنے 100 روپوں جتنا کام تو محض تین گھنٹے میں کرلیا تھا۔باقی یہ جو اضافی تین گھنٹے کا کام اُس نے کیا، وہ دراصل وہی 300 روپیہ ہے جو سرمایہ دار کی جیب میں جاتا ہے۔مزدور کے پہلے تین گھنٹوں کو Essential Time (لازمی وقت) کہتے ہیں۔دوسرے تین گھنٹے سرپلس ٹائم (زائدوقت) کہلاتے ہیں اور اسی سرپلس ٹائم کی اجرت اُسے نہیں ملتی۔

اسی سرپلس ٹائم کی محنت کے نتیجے میں جو پیداوار ہوگی، وہ سرپلس پیداوار ہوگی، یعنی سرپلس ویلیو (قدرِزائد) جو اُس کے نہیں بل کہ کپٹلسٹ کی جیب میں چلا جاتا ہے۔۔جس میں اس نے مالک کو 300 روپیہ دلا دیا۔

سوال: اس سارے پیداواری پراسیس کے اندر مالک، خام مال، ایندھن، مشین، مزدور اور مارکیٹ میں سے سب سے ضروری عنصر کون سا ہوتا ہے؟

جواب: مزدور یعنی محنت۔

مزدور اپنا ''مال'' یعنی اپنی قوتِ محنت سرمایہ دار کو بیچ دیتا ہے۔اسی محنت نامی کماڈٹی سے قدرتی خام مال، کماڈٹی بن جاتا ہے۔اگر مشینری سے اجرتی مزدوروں کا سارا طبقہ ختم کیا جائے تو یہ کپٹل کے لیے کس قدر خوف ناک بات ہوگی۔اس لیے کہ اجرتی مزدور کے بغیر تو یہ کپٹل رہے گا ہی نہیں۔

جاگیرداری نظام میں موجود کھیت کے مزدور کو انگلش میں سَرف (Serf) کہتے ہیں۔وہ سَرف زندگی بھر جاگیردار کی ملکیت ہوتا ہے ۔اس کے برخلاف صنعتی مزدور اپنی پوری زندگی کو کپٹلسٹ کے ہاتھ فروخت نہیں کرتا بل کہ وہ روزانہ اپنے آٹھ، دس یا بارہ پندرہ گھنٹے نیلام کرتا ہے۔ جو صنعت کار زیادہ بولی دے گا، وہ اپنے یہ گھنٹے اُسی کو بیچ دے گا۔یعنی فیوڈلزم کے برعکس کپٹلزم میں مزدور سرمایہ دار کی ملکیت نہیں ہوتا۔دراصل وہ کسی بھی سرمایہ دار کی ملکیت نہیں ہوتا۔اس کے تو

روزانہ کے ''صرف'' وہی آٹھ دس گھنٹے اُس شخص کی ملکیت بن جاتے ہیں جو انھیں خرید لے۔اس لیے جاگیرداری زمانے کے سرفوں کے برعکس صنعتی مزدور جب چاہے اپنے سرمایہ دار کو چھوڑ دیتا ہے اور کسی نئے سرمایہ دار کے ہاتھ اپنے آٹھ گھنٹے فروخت کرتا ہے۔

چوں کہ مزدور کے گزر بسر کا واحد ذریعہ اپنی محنت کو بیچنا ہے، لہٰذا وہ خریداروں کے پورے طبقے، یعنی سرمایہ دار طبقے کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔گو کہ وہ کسی ایک یا دوسرے سرمایہ دار کی ملکیت نہیں ہے، مگر وہ پورے سرمایہ دار طبقے کی ملکیت ضرور ہے، وہ اسی سرمایہ دار طبقے کے اندر ہی کوئی نیا گاہک تلاش کرتا رہتا ہے۔

کپٹلزم میں اگر کپٹل مزدور کو کام نہ دے تو مزدور مر جائے گا۔۔۔مگر پھر کپٹلزم بھی مر جائے گا۔اسی طرح اگر کپٹلزم ''مزدور'' کی قوت کو استعمال نہ کرے تو کپٹلسٹ مر جائے گا اور پھر کپٹلزم بھی مر جائے گا۔لہٰذا یہ تو بالکل بھی نہیں ہوسکتا کہ کپٹلزم مزدور کے بغیر چلے اور یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ کپٹلزم کپٹلسٹ کے بغیر چلے۔

پیسہ آتا کہاں سے ہے؟

ہم نے دیکھا کہ سرپلس ویلیو ناجائز ہے۔اس لیے کپٹل بہ ذاتِ خود ناجائز ہے۔جب کپٹلسٹ کی ساری بنیاد ناجائز ہے تو اس کا سارا نظام ''ناجائزات'' اکٹھا کرنے والا نظام ہوا۔یعنی کپٹلزم رشوت، سفارش، ٹیکس چوری، کمیشن، کک بیک، بجلی اور گیس چوری، اور سمگلنگ کا ملغوبہ نظام ہے۔کپٹلسٹ کا پیسہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

ہم تین چار اور ذرائع بھی گنوا سکتے ہیں جن سے اس کی تجوری پھولتی جاتی ہے۔

* کپٹلسٹ اپنی مشینوں کی کارکردگی بہتر کرتا جاتا ہے۔یوں زیادہ مزدور رکھنے کے بجائے اب وہ ایک ہی مزدور سے زیادہ مشینیں چلواتا ہے۔اس طرح وہ مزید سرپلس ویلیو بٹورتا جاتا ہے۔

* اسی طرح وہ ہر وقت اس بات کی تاک میں رہتا ہے کہ کس طرح وہ اپنے کارخانوں میں کام کرنے والوں کی اجرتیں کم کرے۔

* ایک اور معاملہ یہ ہوا کہ مغربی یورپ کے ممالک جو کہ صنعتی انقلاب کا پنگھوڑا تھے، زبردست رفتار اور مقدار سے ترقی کرتے گئے۔ جب کہ غیر مغربی، اور دیر میں کپٹلزم قبول کرنے والے ممالک کی ترقی سست رہی۔ یوں آج کپٹلزم دو حصوں میں ہے: ڈِویلپڈ کپٹلزم اور ڈِولپنگ کپٹلسٹ ممالک۔ مگر چوں کہ کپٹلزم ایسا سانپ ہے جو اپنے بچے کھاتا رہتا ہے، اس لیے ترقی یافتہ کپٹلسٹ ممالک ترقی پذیر کپٹلسٹ ممالک کا استحصال کرتے رہتے ہیں۔ چناں چہ پاکستان جیسے ڈولپنگ کپٹلسٹ ممالک کی تقدیر میں لکھا ہوتا ہے: استحصال ہوتے رہنا۔

کیسے؟.....ترقی یافتہ کپٹلسٹ مالک ڈولپنگ کپٹلسٹ ملکوں سے خام مال سستا خریدتے رہتے ہیں۔ یعنی یہ ایک اور سورس ہوتا ہے پیسہ بچانے اور کمانے کا۔

ایک اور کام وہ یہ کرتے ہیں کہ جب اُس ترقی پذیر کپٹلسٹ ملک کے خام مال سے پراڈکٹ تیار ہوتی ہے تو وہ اُس پراڈکٹ کو اُسی خام مال والے ملک کو مہنگا بیچتے ہیں۔ اِس گراں فروشی میں انھیں مزید پیسہ حاصل ہوتا ہے۔

اِن سارے اقدامات سے وہ ترقی پذیر کپٹلسٹ ملک غریب ہوتا جاتا ہے اور بالآخر معاشی طور پر محتاج، منحصر اور مفلوج ہو جاتا ہے۔ تب یہ ڈویلپڈ کپٹلزم والا ملک اُس غریب سے اپنا اسلحہ خریدواتا ہے، پڑوسیوں سے اُس کی جنگیں کرواتا ہے۔ نیز وہ اُسے قرضے دے دے کر اچھی طرح پھنسالیتا ہے اور یوں اُس کے داخلی اور خارجی امور کے فیصلے اپنی مرضی سے چلواتا ہے۔

ڈویلپڈ کپٹلزم اِس سارے کھیل کے کھلاڑی کو امپیریلزم یا سام راج کہتے ہیں۔

* سرپلس ویلیو کا نظام اجرتوں کی کمی کے نفاذ کے لیے ایک اور اقدام بھی کرتا ہے۔ وہ اپنا کارخانہ ہی اکھاڑتا ہے اور اُسے غریب ممالک میں لے جا کر لگاتا ہے۔ جہاں بے روزگاری کی وجہ سے مزدور کم ترین اجرت پہ بھی کام کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُسے وہاں کی ریاست زمین مفت، ٹیکسوں میں چھوٹ اور دیگر بے شمار رعایتیں دیتی ہے۔ آج کا چین اس کی مثال ہے۔ مغربی کپٹلسٹ دنیا نے ان ہی حالات و شرائط پہ آٹو موبیل، الیکٹرانکس، انفارمیشن ٹکنالوجی اور انفراسٹرکچر سے وابستہ اپنے سارے کارخانے اپنے ممالک سے اکھاڑ کر چین منتقل کر لیے۔

*****

ہم نے دیکھا کہ کماڈٹی کی پیداوار رفتہ رفتہ اپنی ضرورت سے زائد ہو کر باہر بیچنے یا تبادلہ کرنے کے لیے ہونے لگی۔ جس جگہ یہ خرید و فروخت ہونے لگی وہ جگہ منڈی، پڑی یا مارکیٹ بن گئی۔

اور پھر یہ مارکیٹ طاقت ور ہوتی گئی۔ انفرادی کپٹلسٹوں نے بالخصوص یورپ میں مارکیٹ پہ حاوی ہونے کے لیے کمپنیاں بنالیں۔ مزید منافع بٹورنے کی خاطر اُن کمپنیوں نے آپس میں مقابلے کیے، ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کیں، لڑائیاں کیں۔ موٹی کمپنی نے کم زور کو کھالیا، خرید لیا، یا خود میں ضم کرلیا اور بالآخر ملکی سرحدوں سے باہر کی کمپنیوں سے الحاق کیے، مرجرز کیے اور یوں ایک زمانے کی مقامی کمپنی، قومی کمپنی بنتے بنتے ملٹی نیشنل اور ٹرانس نیشنل کمپنیوں کی شکل اختیار کر گئی۔

یہیں بس نہیں ہوتا بل کہ یہ ٹرانس نیشنل کمپنیاں بھی، ایک دوسرے کے مقابلے میں منافع کے اندر فربہ ہونے کی تگ و دو میں لگی رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ایک دوسرے کو کھا جانے اور صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالنے لگیں۔ چناں چہ کپٹلسٹ دنیا کا ایک قانون ''انضمام اور مرجر'' ہے (اب تو میگا مرجر)۔ ہم روز دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ ایک میڈیا ہاؤس دوسرے کو اپنے اندر جذب کرتا ہے، دوائیوں کی ایک کمپنی دوسری کو کھا جاتی ہے، ایک آئل ٹرانس نیشنل کمپنی دوسری کو خریدتی رہتی ہے، اپنے میں ضم کرتی رہتی ہے۔ کمپنیوں کا یہ مرجر روزمرہ کی بات ہے۔

یوں سرمایہ (کپٹل) تعداد میں بہت انسانوں سے چھنتا گیا اور کم ہوتے ہوتے چند ہاتھوں میں جمع ہوتا گیا۔

دولت کا ارتکاز ہوتے ہوتے اب تو صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ دنیا میں جتنی بھی دولت پیدا ہوتی ہے، اُس سب کے 82 فی صد کے مالک صرف ایک فی صد لوگ ہیں۔

کپٹلزم سرپلس ویلیو نامی نشے کا نشئی نظام ہے۔ کپٹل شراب ہے۔ نشے کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ یہ جلد اتر جاتا ہے اور اسے پھر تازہ کرنا پڑتا ہے۔ شراب شراب ہوتی ہے، یہ آبِ حیات نہیں کہ آپ نے ایک آدھ گھونٹ پی لیا اور جنم جنم جی لیے۔ شراب (سرپلس ویلیو) کو تو لحہ لحہ پینا

ہوتا ہے۔ یہ ہر ہر ساعت میسری مانگتا ہے، ہر ہر گھڑی مسلسل سپلائی چاہتا ہے۔

نہ صرف یہ کہ اس کی مسلسل ترسیل چاہیے، بل کہ ہر روز ڈوز بڑھاتے جانا ہے۔ نشے کی خاصیت ہے یہ.....یعنی؟ یعنی سرپلس ویلیو ہر دم ملتی رہے اور زیادہ مقدار میں ملتی رہے۔

کیپٹلزم پہاڑوں کو روندنے کی قدرت رکھتا ہے۔ یہ خوف ناک بپھرے دریاؤں کو ڈائینو ساری ڈیم بنا کر روکنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ مہیب سمندر اُس کے سامنے اتنا شانت کہ اپنی پیٹھ اُس کے ہزاروں ٹن وزنی بحری جہازوں کو براعظموں تک سواری بننے کے لیے ہمہ وقت حاضر باش کرتا ہے۔ کوئی طبعی جغرافیائی رکاوٹ اس کے سامنے نہیں ٹک سکتی۔

ہم نے دیکھا کہ سرپلس ویلیو، کیپٹلزم کی ماں ہوتی ہے۔ اُس گود کا عادی ضدی بچہ انسانیت، حب الوطنی، دین دھرم اور نام نہاد اخلاقیات کو نہیں مانتا۔ اس لیے کیپٹلسٹ نظام کا جو حکم ران زیادہ محبِ وطن بننے کی باتیں کرے سمجھو کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ مارکیٹ کی نگاہ میں قوم پرستی اس لیے شیطانیت ہے کہ قوم پرستی وسیع منڈی کے سامنے قومی سرحد نامی رکاوٹ ڈالتی ہے۔ اس لیے مارکیٹ نظام کا جو جنرل مشرف قوم قوم اور ''پہلے پاکستان'' بولے سمجھو بہت اُستادی کر رہا ہے۔

کیپٹلزم عقیدے کے نام پر بھی اپنی منڈی کو محدود رکھوانے نہیں دیتا۔ اسی لیے کیپٹلزم نہ یہودی ہوتا ہے اور نہ مسلمان۔ مگر وہ مذاہب کو استعمال خوب کرتا ہے۔ ہم نے دیکھا کہ کیپٹلزم کا بیٹا ضیاء الحق جتنا زیادہ مذہب کی بات کرتا تھا، اتنا ہی زیادہ مارکیٹ کے مندر کا اس کا متولی پن ظاہر ہوتا جاتا تھا۔

کیپٹلزم تکبر نہیں کرتا، امتیاز نہیں کرتا۔ اس کے ہاں نہ سیاہ فام تحقیری حیثیت رکھتا ہے اور نہ گورا افضل مقام کا مالک ہے۔ اس کے لیے زبان، عقیدہ، رنگ، اور نسل کا امتیاز بے کار کی باتیں ہیں۔ وہ ان سب سے بلند ہے۔

منافع کا ویٹیکن انسان کی جیب ہوتا ہے.....دنیا کے ہر انسان کی جیب۔ کیپٹلزم جیب کی پوجا کرتا ہے۔ وہ اُس وقت تک دوسرے کی جیب کی پوجا کرتا ہے جب تک کہ اسے خالی نہ کر دے اور ایسا وہ عالمی طور پر خریداروں یعنی صارفوں کا کلچر لاگو کر کے کرتا ہے۔ چناں چہ جس لفظ

گلوبلائزیشن سے ہم آپ آشنا ہیں، وہ دراصل کنزیومر کلچر کی گلوبلائزیشن ہے۔

چوں کہ سرمایہ یا کیپٹل یا پیسہ نامی کیپٹلزم کی ماں، پوری دنیا میں جڑیں پھیلائے بکھری پڑی ہے۔ اسی لیے کیپٹلزم اپنی ماں کی تانگ میں دنیا میں ہر جگہ پر حاضری بھرنے اور ہر کونے سے روابط رکھنے پہ ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔

ہم امیر ہوں یا غریب، کالے ہوں یا گورے، ایشیائی ہوں یا امریکی، بلوچ ہوں یا عرب سب ایک ہی عالمی نظام میں زندگی گزار رہے ہیں: سرپلس ویلیو کے نظام میں، سلطنتِ سرپلس ویلیو میں۔ باقی ہم خواہ قذافی کی طرح ٹینٹ میں سو جانے کا ناٹک کریں یا واشنگٹن میں جا کر عبایہ میں آٹھواں عجوبہ بننے کی کوشش کریں، دراصل یہ سب کوششیں خود فریبی اور شوبازی ہے۔ ایک آدھ ملک کو چھوڑ کر سارے آٹھ ارب انسان غلامانِ دربارِ مارکیٹ ہیں اور بساور دربار میں تو بجا آوری ہوتی ہے، کوئی اکڑ، افتخار نہیں چلتے۔ جو پھوں پھاں یا جوڈائیلاگ بازی صبح شام یہاں کی فیوڈل یونی ورسٹیوں سے فارغ شدہ سیاست دان اور دانش ور ٹی وی اور فیس بک پر کرتے ہیں، سب سطحی ہے۔ کوئی نیل اور کاشغر کی پاسبانی دوہراتے دوہراتے ہمارے لُوٹے جانے کا بندوبست کر رہا ہوتا ہے، اور کوئی قومی افتخار جپتے جپتے عوام کی جیب کٹوا آتا ہے۔ کیپٹلزم میں لٹنے سے استثنا کی سہولت کسی کو حاصل نہیں ہے۔ کیپٹلزم کے ہزاروں ہاتھ ہیں، سیکڑوں پیر ہیں، درجنوں آنکھیں اور بیسیوں کان ہیں۔ سرپلس ویلیو کی آماج گاہ کیپٹلزم کا، کوئی وطن، کوئی زبان، رنگ، نسل اور مذہب نہیں ہوتا۔ وہ خود ہی یونیورس ہوتا ہے، انٹرنیشنل ہوتا ہے۔

کیپٹلزم سپر سونک رفتار سے رواں رہتا ہے۔ یہ بہت حقارت سے نام نہاد سرحدیں توڑتا جاتا ہے، ریاستوں کی قوم پرستی کی گردن مروڑ کر اپنے لیے بڑی مارکیٹ تشکیل کر دیتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ بلوچستان میں اونٹوں کے کاروان سے ہر قبیلہ اپنے اندر سے گزرنے کا ٹیکس لیتا تھا۔ تصور کیجیے کہ سومیانی بندرگاہ سے لے کر ملتان تک جانے والے مال کاروان کس کس علاقے کے سردار کو ٹیکس دیتا ہوگا۔ مگر اب کیپٹلزم ایسا کرنے نہیں دیتا۔ مثلاً ریل وے ہر رکاوٹ کو کچلتے ہوئے اس کے مال کی ٹرانسپورٹ یقینی بناتا ہے، اس کے مال کے کنٹینروں کے لیے بین الاقوامی شاہراہیں

حاضر ہیں۔ دیوہیکل بحری جہاز اپنے کندھوں اور سر پہ اُس کے مال کے انبار لادے ایک براعظم سے دوسرے تک جاتے ہیں۔

اسی طرح مارکیٹ اور منافع ایسا نشہ ہوتا ہے جسے حاصل کرنے کے لیے کاروباری معاملات اور منافع کی راہ میں رکاوٹیں اور مسائل دور کرنے کے لیے کارپوریشنوں کے منیجروں کو ضروری اور لگاتار ہوائی سفروں کے لیے تمام سہولتوں سے آراستہ ہوائی جہاز ہمہ دم حاضر باش ہیں۔ سرپلس ویلیو وہ ڈریگن ہے جو جب چاہے مچھلی بن کے سمندر میں کلانچیں مارے، جب چاہے زمین پہ فراٹے بھرے اور جب چاہے آسمان پہ دیوہیکل ٹرانسپورٹ جہاز بن جائے۔

کیپٹلسٹ امیر سے امیر تر بننے کے لیے، اپنا اثر رسوخ بڑھانے کے لیے اور مارکیٹوں کی تقسیم میں بڑا حصہ لینے کے لیے، آپس میں جنگیں کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ اس کی پیشہ ورانہ ضرورت ہے۔ گوکہ جنگیں تو فیوڈل سماج میں بھی ہوتی تھیں مگر چوں کہ وہ بہت قریب کی زمینوں پہ قبضے کے لیے ہوتی تھیں اس لیے اتنی خطرناک نہیں ہوتی تھیں۔ کیپٹلزم تو عالمی جنگیں چھیڑتا ہے، ایف 16 اور ڈرون سے ہلاکت خیز بم باریاں کرتا ہے، حتیٰ کہ ایٹم بم مارتا ہے۔ یوں وہ دنیا کو اپنی مطابقت میں ڈھالتا جاتا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ آج ساری دنیا کیپٹلزم کی مہیب ترین مشین یعنی، آئی ایم ایف، ورلڈ بینک اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کی ہلاکت خیز پالیسیوں سے بندھی ہوئی ہے۔ جنھیں بہ وقتِ ضرورت ڈیزی کٹر بموں سے لاگو رکھا جاتا ہے اور ہیروشیما اور ناگاساکی بنائے جاتے ہیں۔

اشتہار

دنیا بھر میں اپنی پراڈکٹ بیچنے کے لیے کیپٹلزم کے بے شمار ہتھکنڈوں میں سے ایک کمال ہتھیار ''اشتہار'' ہے۔ یہ اشتہار پچھلے زمانوں میں اخباروں رسالوں میں چھپتے تھے پھر جب ریڈیو آیا تو اُسے استعمال کیا گیا، اب تو ٹی وی اور کمپیوٹر کے بے شمار ماہر اور کثیر الجہت ہاتھ (انٹرنیٹ، فیس بک، ٹوئٹر وغیرہ) اس اشتہار بازی کے لیے وقف ہو چکے ہیں۔

اشتہار کا کیا مطلب ہے؟ اشتہار کا مطلب ہے: ''نقلی ضرورت پیدا کرنا'' اور اشیا کی خریداری کی خواہش پیدا کرنا ہے۔ آپ کے اندر بغیر بھوک کے کسی چیز کی بھوک پیدا کرنا۔ بغیر ضرورت کے ضرورت پیدا کرنا۔ یہ ایک غیر انسانی اور غیر فطری بھوک ہوتی ہے، اس لیے کہ یہ بھوک پیدا نہیں ہوتی، پیدا کی جاتی ہے۔ ٹائیڈی سی، پلاسٹکی سی، سوفسٹی کیٹڈ سی بھوک۔

آپ مارکیٹ کے ''دانگ زدہ'' بگ کے اونٹ بن جاتے ہیں۔ یعنی، نشانہ بنا کر آپ کو غیر ضروری اشیا کا ضرورت مند بنایا جاتا ہے۔ آپ کا پیسہ بغیر کسی ضرورت کے آپ کی جیب سے پھسلتا جاتا ہے اور مارکیٹ کے مالک کے بینک میں گرتا جاتا ہے۔ آپ اس کے اتنے عادی بن جاتے ہیں کہ بعد میں زیاں کا احساس ہی نہیں رہتا اور آپ خود کو اکیلے میں بھی نہیں کوستے۔

پانی موجود مگر آپ کو منرل واٹر پر لگایا جاتا ہے، آپ تمباکو نوشی نہیں کرتے مگر اشتہار آپ کو سگریٹوں پر لگا دیتے ہیں۔ شمپو، سے لے کر کار موٹر تک اشتہار آگے آگے، انسان پیچھے پیچھے، جب تک کہ جیب کا آخری آنہ ٹکہ تک نکلا نہ ہو اور اب تو ٹکہ کو بھی نہیں دیکھا جاتا۔ آدمی مارو اشیا خریدو، گردے بیچو، اشیا خریدو۔ لاش، وطن بیچو، اشیا خریدو۔

''زمانہ جیٹ کی رفتار سے ترقی کر رہا ہے۔ ہر لمحہ چیزوں کی شکلیں بدل رہی ہیں۔ گزشتہ سال کی مرسیڈیز نئے ماڈل کے سامنے جیسے چھکڑا، پرانی استری نئی کے سامنے بالکل کھٹارا..... آج خریدو، کل پرانی۔ آپ اشتہار کے زور پہ نیا موبائل فون خریدیں گے مگر اشتہار ہی تین ماہ کے اندر اندر آپ کے اس موبائل کو بے کار اور آؤٹ ڈیٹڈ ثابت کر دے گا اور آپ سے اس کا جدید ماڈل خریدوائے گا۔ نیا نیا، جدید جدید، لذیذ لذیذ۔ بس خریدتے جاؤ، کُڑھتے جاؤ، ترستے جاؤ۔ پھر خریدو پھر پچھتاؤ۔ سب کچھ پا کر بھی وہی محرومی، نامرادی اور احساسِ کم تری''۔ (عصمت چغتائی: خرید لو)

اشتہار کافر نہیں کفار چیز ہے۔ یہ بہت ناز سے، تسلسل کے ساتھ، آپ سے چیزیں خریدواتا رہتا ہے۔ ہم عصمت چغتائی کو نقل کریں گے جس نے ''خرید لو'' میں ہمیں سب کچھ ایسے انداز میں سمجھایا کہ میرا قلم واپس جیب میں۔

''جب کبھی نیا فیشن آتا ہے، تو فوجی ناکہ بندی سی شروع ہو جاتی ہے۔ چپکے چپکے ہزاروں

لاکھوں کی تعداد میں تیار کر کے ہر سٹور کی ہر شاخ میں مال پہنچا دیا جاتا ہے۔ ہر شوکیس سجا دیا جاتا ہے اور پھر حملہ شروع ہوتا ہے۔ خرید لو۔ جلدی۔ فوراً نہیں تو مٹ جاؤ گے، تباہ ہو جاؤ گے۔ ساری عمر سر دھنو گے۔ وقت جا رہا ہے۔ سٹاک ختم ہو جائے گا، ابھی، اسی دم نہ خریدا تو قیامت آ جائے گی، عاشق منہ پھیر لیں گے، شوہر طلاق دے دیں گے، باس نوکری سے نکال دیں گے، ساری عمر کنواری یا طلاقن بن کر سسکو گی۔ نقد خرید۔ چلو قسط پر، ادھار ہی خرید لو، ورنہ یہ معمہ حل کرو تو مفت ہی لے جاؤ.....نقد خریدو، تو ساتھ میں لسکٹ کا ڈبہ مفت.....مفت.....ایک دم خریدو تو صابن کی ٹکیاں بالکل مفت۔

''روٹھے ساجن کو منانا چاہو تو فلاں جھاڑو فوراً خریدو، باس کو غلام بنانا چاہو تو اسی دم نیا چولھا خریدو۔ میاں طلاق دے رہا ہے۔ دوسری عورت پر ریجھ رہا ہے، کیوں کہ وہ ہمارا بغل گندلوشن اور منہ کی سڑاند دور کرنے والا پیسٹ استعمال کرتی ہے۔ گھر نہ بگاڑو، تم بھی خرید لو.....''

''اچھی نوکری چاہیے تو جسم کو نکیلا اور ننگا دکھانے والی برا خریدو!

''اس کمبل میں خواب زیادہ سہانے ہوں گے۔''

''یہ میدہ کیک بنانے میں استعمال کرو، وہ تمھیں گود میں اٹھا لے گا'' (تصویر: ایک ہیرو کی گود میں ٹانگیں چلاتی حسینہ)

''پڑوسن کا میاں بہت بوسے لیتا ہے، کیوں کہ وہ ہماری نئی استری استعمال کرتی ہے، تم کیوں ترسو؟''

کارپوریٹ سیکٹر کے اشتہارات بہت ہی مقبول باتوں کو پیش نظر بنا کر تیار کی جاتی ہیں۔ اور یہ کام الگ سے اشتہاری کمپنیاں کرتی ہیں۔

اتنا پیسہ کرنا کیا ہے؟

منافع ایسی پیاس ہے کہ کسی طور بجھتی ہی نہیں۔ اِس پیاسے ایک فی صد آبادی کے ہونٹ مکران کی ریت کی طرح سوکھے ہی رہتے ہیں۔ پیٹ پانی (منافع) سے پھولا ہوا مگر لب خشک۔ یہ لب کبھی تر ہوتے ہی نہیں۔ اس پیاس کو بلوچی میں ''آف ڈھاگ'' کہتے ہیں۔ کپٹلسٹ کو سرپلس

ویلیو کے ''آف ڈھاگ'' کی پیدائشی بیماری لگی ہوتی ہے۔

یہ پیاس کیوں؟ یہ حرص کیوں؟ وہ اس قدر زیادہ سرپلس ویلیو سے حاصل کیے ہوئے سرمایہ کو استعمال کہاں کرتا ہے؟ اس بے پناہ سرمائے کا انت آخر کیا ہے؟

یہ سرمایہ چار مدّوں میں مکمل طور پر خرچ ہو جاتا ہے۔ اتنا کہ اُس کے پاس کچھ نہیں بچتا۔ لہٰذا وہ پھر پیاسا ہو جاتا ہے اور پھر پاگل پن میں مزید سرمایہ نچوڑنے میں لگ جاتا ہے:

1۔ انھیں امیر ترین شخص کہلائے جانے کا شوق ہوتا ہے۔ ''سب سے بڑا خیرات کرنے والا'' بننے کا شوق۔ پیسہ گننے کا شوق، گنتے رہنے کا جنون۔ بینک بیلنس۔

بلوچی کی ایک فوک کہانی کہتی ہے کہ ایک بھکاری سارا دن بھیک مانگتا تھا۔ شام کو اپنی جھونپڑی میں پہنچ کر کھڈا کھودتا۔ وہاں پڑے ہوئے پچھلے سارے سکے اور نوٹ گنتا، پھر آج کی ریزگاری گن کر اُس میں شامل کرتا، دوبارہ کھڈے میں دفن کرتا اور سکون سے سو جاتا۔ بستی کے کسی شرارتی بچے کو اس کی اس عادت کی خبر ہو گئی۔ اس نے دو چار دوستوں سے مل کر ایک شام اس کی آمد سے ذرا پہلے کھڈے سے پیسے نکال کر جھونپڑی میں دوسرے کونے میں رکھ دیے۔ شام کو جب پیسہ گننے کا شوقین بھکاری آیا تو سیدھا کھڈے کی طرف گیا۔ کھودا، اسے خالی دیکھا تو وہیں مر گیا۔

2۔ وہ اس انبار سرمائے کا ایک حصہ اپنی ضروریات (عیاشی) پہ صرف کرتا ہے۔ عیاشی جو کبھی ختم نہیں ہوتی، کبھی کم نہیں ہوتی۔۔ لامحدود اور لامختتم۔ وہ اپنی طرح پورے معاشرے کو خرچ واصراف سے مسرت کے حصول کے نامعقول کنفیوژن میں ڈال دیتا ہے۔ ایک طرح کی حرص، ہوس نا کی اور بھیڑیا گیری ہے کہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

3۔ عجیب عجیب خواہشات کی تکمیل۔ گورکی نے بہت بڑے پیسے والے آدمی کا انٹرویو لیا کہ اس کی کون سی خواہش ہے جو ابھی پوری نہیں ہوئی۔ اُس امیر آدمی نے اپنے وسیع لان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنے پیسے سے دنیا کے طاقت ور ترین دو ملکوں کے سربراہوں کو کرایہ پہ لے کر اپنے اس لان میں اُن کی کُشتی کروانا چاہتا ہوں۔

4۔ مزید سرمایہ ہتھیانے کے لیے وہ بقیہ سرمایہ پھر پیداواری عمل میں ڈال دیتا ہے۔

کیپٹلزم کی تباہیاں، تباہ کاریاں

ہر دم جوانی کی دوائیاں پی پی کر تازہ دم اس مردِ معمر میں، مگر پانچ پیدائشی بیماریاں موجود ہیں: معاشی بحران، ماحولیاتی بحران، نیوکلیئر تباہی، بیگانگی اور اخلاقی بحران۔

معاشی بحران

سرپلس ویلیو کے عالمی نظام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اِس میں اوسطاً ہر چھ آٹھ برس بعد معاشی بحران پیدا ہوتا رہتا ہے۔ منافع کی لالچ میں پیداوار بڑھاتے بڑھاتے اُس کے ہاں تیار مال کی مقدار بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس قدر زیادہ کہ اس ''سارے'' کی فروخت اور کھپت ناممکن ہو جاتی ہے۔ چناں چہ وہ عوام کی قوتِ خرید کو پیشِ نظر رکھ کر قیمتیں کم کر کے دیکھتا ہے مگر خریداری میں کوئی بہتری نہیں ہوتی۔ سوائے اس بات کے اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا کہ اُس کے مقابلے والے سرمایہ داروں کا بھٹہ بیٹھ جاتا ہے۔

''اوور پروڈکشن'' کی وجہ سے ''اوور پروڈکشن بحران'' پیدا ہوتا ہے۔ گودام بھرے ہی رہتے ہیں، سڑ جاتے ہیں۔ معاملہ اس قدر گھمبیر ہو جاتا ہے کہ اِس مال کو ٹھکانے لگانا ضروری ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دار اب دو کام کرتا ہے:

1۔ سارے گوداموں کو خالی کرتا ہے۔ فروخت نہ ہو پانے والی پراڈکٹس کو آگ لگاتا

ہے، انھیں مٹی میں ملا کر استعمال کے قابل نہیں چھوڑتا۔ اگر اناج ہے تو اُسے سمندر میں پھینکوا کر گوداموں کا بوجھ خالی کیا جاتا ہے۔ عالمی اخبارات میں آئے دن ایسی خبریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ محترم غنی پرواز نے ایسے کچھ واقعات ہمارے لیے جمع کیے:

''1929-33ء کے عالمی بحران کے دوران امریکا میں کوئلے کے بجائے گیہوں اور مکئی کو ایندھن کے طور پر استعمال کیا گیا، کپاس کا بیش تر حصہ کھیتوں میں ہی خراب ہونے دیا گیا۔ لاکھوں سوئر مار دیے گئے۔ برازیل میں قہوے کی لاکھوں بوریاں سمندر میں پھینک دی گئیں۔ ڈنمارک میں سیکڑوں گائیں مار ڈالی گئیں۔ فرانس اور اٹلی میں ہزاروں ٹن پھل ضائع کر دیے گئے۔ حالاں کہ اُسی دوران عام غریب لوگ اپنی اہم ترین ضروریات سے بھی محروم رہے۔''

2۔ بورژوازی (کیپٹلسٹ) اپنے کارخانے اور فیکٹریاں مکمل طور پر بند کر کے مزدوروں کو جاب سے نکال باہر کرتا ہے۔

یہ معاشی بحران اب اپنے پر پھیلا کر سیاسی ثقافتی بحران بن جاتا ہے۔

معاشی بحران سرمایہ داری نظام میں اس لیے ناگزیر ہے کہ اس میں پیداواری عمل تو اجتماعی ہے مگر پیداوار کی ملکیت نجی ہے۔ یہ ایک بنیادی تضاد ہے اور اسی کے اندر سرمایہ داری نظام میں معاشی بحران جنم لیتا رہتا ہے۔

سرمایہ داری نظام کا بنیادی تضاد مزدوروں اور مل مالکوں کی کش مکش کی صورت میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ کیوں نکہ سرمایہ داری کی ترقی کے ساتھ ساتھ ذرائع پیداوار چند ہاتھوں میں سمٹ جاتے ہیں اور عوام کی بڑی اکثریت محنت کشوں کی صفوں میں شامل ہو جاتی ہے جو معاشی بحران کے دوران بے روزگاروں کی صفوں میں اضافہ کرنے کا سبب بنتی ہے۔

دونوں صورتوں میں ایک عالمی انسانی المیہ وقوع پذیر ہو جاتا ہے۔ چناں چہ 1929ء میں سٹاک مارکیٹ کریش سے لے کر 2007ء کے بحران تک اور پھر 2022ء کے معاشی recession (کساد بازاری) تک ایک پورا دائرہ ہے جو ہر چھ آٹھ سال بعد چلتا آ رہا ہے۔ اس لیے ماہرین نے اس کا نام ''Cyclic Crisis of Capatalism'' رکھا ہے۔

کیپٹلزم کے اندر اس عالمی انسانی بدبختی کا کوئی حل موجود نہیں ہے۔ معاشی بحران سے نجات سرمایہ داری کے خاتمے پر ہی منحصر ہے۔

ماحولیاتی بحران

زندگی کو ہلکا نہ لینے والے جانتے ہیں کہ دنیا میں ماحولیاتی بحران اب ایٹمی جنگ جتنا بڑا خطرہ بن چکا ہے۔ ہماری پوری تاریخ میں انسان اور نیچر کے بیچ ہمیشہ سے ایک توازن موجود رہا ہے مگر اندھا دھند انڈسٹریلائزیشن کے سبب اس توازن میں ایک بنیادی جھول پیدا ہو گیا ہے اور یہ عدم توازن پیدا کیا منافع نے، منافع کے لالچ نے، کیپٹلزم نے۔ ''منافع'' بہت ناترس، پیاسا اور لامحدود جذبہ ہوتا ہے۔ یہ بنی نوعِ انسان کے خلاف بھیڑیوں اور لگڑ بھگڑوں کی ایسی دوڑ ہے جس میں ''جیتنا'' نہیں، بل کہ ''جیتتے رہنا'' ہی مقصد ہوتا ہے۔ ''جیتتے ہی رہنے'' میں اُن کی بقا ہے، وگرنہ بھیانک موت۔ اس دوڑ کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مدمقابل خواہ جان دار ہوں یا کاربن سے بنی ''اشیا'' بس اُسی کی تجوریاں بھرتے رہنے کا کام کرتی ہیں۔ کیپٹلزم نے منافع کی خاطر اپنے اندر موجود موروثی تباہ کن سرمایہ دارانہ پیداواری پراسیس کو تیزی سے اور اندھا دھند انداز میں بڑھایا۔ بالخصوص اُس نے فاسل فیول انڈسٹری (پٹرول، سوئی گیس، کوئلہ) میں سرمایہ کاری کرنے میں لامحدود دوڑیں لگائیں۔ نتیجہ یہ کہ ماحولی آلودگی خطرناک سطح تک بلند ہو چکی ہے۔ منافع کی نہ بجھنے والی پیاس نے، ایک طرف تو زمین کے محدود وسائل کو کم کر دیا اور دوسری طرف ماحولیاتی تباہی کو برداشت کرنے کی زمین کی سکت سے کئی گنا بڑا بوجھ اُس پہ ڈال دیا۔

ہم انسان نیچر (فطرت) سے الگ نہیں، بل کہ اِس کا حصہ ہیں اور ہم نیچر کے ساتھ لیبر پراسیس کے ذریعے انٹرایکٹ کرتے ہیں۔ مگر لالچی کیپٹلزم نیچر اور انسانی معاشرہ کے درمیان موجود باہمی انحصار میں ایک بڑی دراڑ پیدا کرتا ہے، ایک دشمنی پیدا کرتا ہے۔ یوں یہ انسانوں کے اندر اپنے لیبر سے اور نیچر سے بے گانگی پیدا کرتا ہے۔ سلسلہ نہ رکا تو ماحولیاتی بحران تباہ کن ہوتا جائے گا اور اس کے مہلک اثرات نسلوں تک انسانیت کو کھرچتے رہیں گے۔

کیپٹلسٹ پیداوار کی انارکی، استحصال اور عدم مساوات ماحولیات کے اس بحران کو تیز کرتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اِس بحران سے نمٹنے کی ہر کوشش کی جڑیں کاٹتا ہے۔

یہ بحران کیا ہے؟ یہ بحران ہے سطح سمندر کی بلندی کا، گلوبل وارمنگ کا، بہ یک وقت قحط اور سیلاب کا، صحراؤں کے رقبے میں مسلسل وسعت کا، موسموں کی انتہا پسندی کا، سمندر کی تیزابیت کا اور وسیع پیمانے پر درختوں، پودوں اور جانداروں کی انواع یعنی Species کی معدومیت کا۔

ماحولیاتی بحران اپنی تباہی کے ساتھ اکیلا نہیں آتا۔ اس سے بڑے پیمانے پر مالیاتی بحران پیدا ہوتے ہیں، وسیع معاشی مائیگریشنیں ہوتی ہیں، غربت، بھوک، بیماریاں عام ہو جاتی ہیں اور ٹکنالوجیکل انقلاب کے ذریعے مزدوروں کی بڑھتی ہوئی معاشی مہاجرت مہیب ہوتی جاتی ہے۔

منافع انسانیت کی التجاؤں، صداؤں، ماتموں کے سامنے بہرا اور اندھا ہوتا ہے۔ اُسے پروا ہی نہیں ہوتی کہ اس کی اندھا دھند اور بے اصول و بے قانون وسعت کی بیماری اُس کی اپنی ہست ہی کو خطرات سے دوچار کرتی جاتی ہے۔ دھڑا دھڑ صنعتیں لگاتے جاؤ، بے روک ٹوک کنزیومر اور صارف پیدا کرتے جاؤ۔ وہ اس بات پہ کان ہی نہیں دھرتا کہ اس کے بہرے حرص اور اندھی لالچ سے دنیا گلوبل وارمنگ اور گرین ہاؤس اثرات کے بیچ لا کھڑی کر دی گئی ہے۔ سب کچھ بھسم ہونے کو ہے مگر کیپٹلزم کے اس خودکش رجحان کا اُس کے اپنے پاس بھی کوئی علاج موجود نہیں ہے۔ یہ تیزی سے انسانیت کو ختم کرتا جا رہا ہے۔

ماحولیاتی تباہی سے بچنے کا حتمی طریقہ یہ ہے کہ انسانیت کو ''منافع'' نامی لاعلاج مرض سے نجات دلائی جائے۔ سماج کی ریڈیکل تنظیمِ نو ہی حل ہے اور تنظیمِ نو کا مطلب پوری انسانیت کے قدرتی وسائل کا مشترکہ استعمال ہے، دولت کی ازسرِنو تقسیم ہے۔ ورکنگ کلاس اور عوام الناس کی منظم قوت کے ذریعے مداخلت ہے۔ بین الاقوامی ورکنگ کلاس کا اتحاد ہے۔

ایٹمی جنگ کا خطرہ

زندگی دنیا میں حسن، خوشبو، مناظر، لطف، مسرت اور نعمت کے اجتماع کا نام ہے۔ اس

دلبر زندگی کو 1940ء سے ایٹمی جنگ کا ایک بڑا خطرہ درپیش ہے۔ پورے کرۂ ارض کو یہ خطرہ درپیش ہے، امریکا سے۔ پیسہ ضائع کرنے والے جنگی اخراجات، اس ملک کے بجٹ کا نصف بناتے ہیں۔ دوسری عالمی سام زاجی جنگ میں ایٹم بم کے ذریعے نظام بچانے کی کوشش کی گئی مگر وہاں سوشلسٹ ملکوں کی ایک رجمنٹ پیدا ہوگئی اور دوسری طرف غلام ممالک کی طرف سے آزادی کی فیصلہ کن جنگوں نے سام راجی نظام کے گھٹنے ٹیکوا دیے۔

اور پھر سوویت یونین 1991ء میں فوت ہوگیا۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ اُس کی فوتگی کے بعد امریکا ایک نارمل ملک بن جائے گا۔ سوویت مرگ کے بعد جنگ پہ خرچہ کرتے رہنے کا امریکا کا سب سے بڑا جواز ختم ہوگیا ہوگا۔ مگر نہیں، ایٹمی اسلحہ سازی کی بھٹیاں فیکٹریاں تو اُسی طرح گرم اور سرگرم ہیں۔ دنیا بھر میں اس وقت امریکا کے 800 فوجی اڈے ہیں۔ یہ جو خیال تھا کہ کولڈ وار کے خاتمے کے بعد ایٹمی تباہی کا خطرہ کم ہوگا، غلط ثابت ہوئے۔ آج یہ خطرہ کولڈ وار کے زمانے سے کئی گنا زیادہ بڑھ چکا ہے۔

اس خطرے کا کم کرنا انسانیت کا دوسرا بڑا چیلنج ہے۔ بالخصوص امریکی ''سماج'' کو غیر فوجی بنانے کی اشد ضرورت ہے۔ سمجھ لینا ہوگا کہ ملٹری مصنوعات پر خرچ کیا جانے والا ہر ڈالر انسانیت کی روحانی، اخلاقی اور طبعی موت میں حصہ دار ہے۔ یہی ایک ڈالر تو ہمیں ماحولیاتی بحران سے نمٹنے کی طرف خرچ کرنا تھا، انفراسٹرکچر کو بہتر بنانے پر صرف کرنا تھا، ہیلتھ، ایجوکیشن اور ہاؤسنگ پر لگانا تھا۔

بیگانگی

ایلی نیشن (Alienation)

ہم نے اکثر ٹی وی یا سوشل میڈیا میں معدنی کان مزدور کے ہاتھوں میں چھالے پڑی ترس ابھارتی تصویریں دیکھی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مزدور پہ ترس اور ہم دردی پیدا کرنے والی تصویریں، کمنٹس، کیپشن اور شاعری ہم جا بہ جا دیکھتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا محنت ایک بوجھ ہے، ایک بے چارگی والی بات ہے؟ کیا محنت کرنا محض مجبوری ہے، جبر ہے، compulsion ہے؟ اسی طرح کیا محنت کش پہ ترس کھایا جانا چاہیے؟

بات اس کے بالکل الٹ ہے۔ محنت ہرگز بوجھ نہیں، مزدور نہ تو قابلِ رحم ہے اور نہ قابلِ ترس۔ اس لیے کہ محنت تو انسانی باشعور سرگرمی کا اہم ترین جزو ہے جو ہمیں جانوروں کی دنیا سے بلند کرتی ہے۔ انسان مکمل ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ محنت کرتا ہے۔ محنت ہماری species پہ نیچر کی طرف سے لاگو کردہ ایک لازمی شرط ہے۔ نہ صرف لازمی، بل کہ دائمی بھی۔ محنت وہ محترم، معزز اور ممتاز عمل ہے جو صرف اور صرف اشرف المخلوقات یعنی انسان سے مخصوص ہے۔

قابلِ ترس تو محنت نہ کرنے والا ہٹا کٹا کیپٹلسٹ ہوتا ہے۔ وہ شخص قابلِ رحم ہوتا ہے جو محنت نہیں کرتا، جو دوسروں کی محنت پہ کھاتا پیتا اور عیاشیاں کرتا ہے۔ دوسروں کی محنت پہ پلنے والا ہی طعنہ اور نفرت کے قابل ہوتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ کام نہیں کرتے اور ''امیر'' کہلواتے ہیں، وہ بہ طور انسان انتہائی بے امید، ویران اور خود غرض لوگ ہوتے ہیں۔ جو شخص جتنا زیادہ امیر ہوگا اتنا ہی اندر سے سڑا ہوا ہوگا۔ اب تو دنیا میں چند فی صد لوگ بہت، بہت، بہت امیر ہیں۔ ان امیروں کا انسانی زندگی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں، ماسوائے لوٹ کے۔ انھیں عام انسانی شادی غم، رسم و قانون اور کھیل و آرٹ سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ کوری، بے کیف اور سڑاند بھری حیات۔

اور یہ بے کیف انسان، اپنی کوری زندگی اپنے مزدور کو منتقل کرنے کا جرم کرتا ہے۔ محنت جو انسان کی آن شان اور افتخار و امتیاز ہے، اُس وقت رذیل و ذلیل بن جاتی ہے جب اس پہ کیپٹلسٹ کا قبضہ ہو جاتا ہے۔

مشینوں کے آنے سے قبل انسان دست کاری کرتا تھا۔ درکھان، لوہار، جولاہا وغیرہ کے بہ طور۔ وہاں اُس کے اوزار اُس کی مرضی کے تابع تھا۔ دست کاری میں کام کرنے والا دست کار اپنے اوزار کو استعمال کے مطابق بناتا ہے، جب کہ فیکٹری میں مشین آدمی کو استعمال کے مطابق بناتی ہے۔ دست کاری میں اوزار کی حرکات مزدور سے روانہ ہوتے تھے مگر کیپٹلزم میں مزدور کو مشین کی

حرکت کی پیروی میں بھاگنا ناچنا ہوتا ہے۔ دستکاری میں کام کرنے والے جان دار میکنیزم کے حصے ہیں، جب کہ فیکٹری میں کام کرنے والا فیکٹری کا محض زندہ ذیلی ضمیمہ بن جاتا ہے۔ وہ اپنے کام میں دل کشی کی ہر باقیات کو تباہ کرتا ہے اور اسے ایک نفرت انگیز جان توڑ مشقت بناتا ہے۔

دست کار کے کام کی جگہ ایک عوامی بیٹھک ہوتی تھی۔ دست کار کام کر رہا ہوتا، ساتھ میں گپ شپ بھی ہوتی۔ لوگوں کا آنا جانا رہتا۔ حال حوال ہوتا، تبصرے ہوتے، ہنسی مذاق ہوتا، حکایتیں لطیفے، سفرنامے، موسیقی پہ باتیں ہوتیں، گیت اور گانے ہوتے۔ مال مویشی، فصل اناج، قیمتیں، اور رسم ورواج پہ گفت گو ہوتی۔ یوں یگانگت اور زندگی کی ہلچل رہتی۔

مگر جب سماج ترقی کر گیا۔ دست کار کے اوزار کی جگہ مشین آ گئی تو وہ مشین اب مزدور کی مرضی پہ نہیں چلتی۔ اب تو مزدور (انسان) کو مشین کے اشاروں پر چلنا پڑتا ہے۔ وہ مشینوں کا پُرزہ بن گیا۔ اُس کو اب نہ اپنی محنت کے دورانیے پہ اختیار رہا، نہ اپنی محنت کی نوعیت وہ خود مقرر کر سکتا ہے اور نہ اب اسے اپنی محنت کی پیداوار سے کوئی سروکار ہے۔ ہر شئے اُس کے لیے غیر بل کہ اُس کی ذات کی حریف بن جاتی ہے۔

اسی حالت کو alienation کہتے ہیں۔ یہ ایک اٹالین لفظ ہے جس کا مطلب ہے: کسی اور علاقے کا آدمی، ''غیر''، بے گانہ۔

فلاسفر مارکس نے بیگانگی کی چار شکلیں متعین کی ہیں:

1۔ محنت کش کی اپنی محنت سے بیگانگی: محنت کش کے پاس اپنی بنیادی ضرورتوں کو پُورا کرنے کا بس ایک ہی ذریعہ ہے: اپنی قوتِ محنت کو کسی غیر کے ہاتھ فروخت کرنا۔ ایسی صورت میں محنت، اُس محنت کش کی ذات سے خارج شئے بن جاتی ہے۔ پیداوار کے عمل میں مزدور کی اپنی سرگرمی کے ساتھ رشتہ ایک اجنبی کی طرح ہو جاتا ہے، ایسا جو اُس کا نہیں ہے بل کہ اب اس کی یہ محنت اُس کے دشمن طبقے کی ہے، یعنی اس کی اپنی محنت اُس کے مدِمقابل آ کر اس کے دشمن کی خدمت گار بن جاتی ہے۔ چناں چہ اب اس کی یہ سرگرمی ایک تکلیف بن جاتی ہے۔ اس کی طاقت اس کی بے طاقتی میں بدل رہی ہے، اس کی تخلیق اسے لاغری اور کم زوری کی طرف دھکیلتی جاتی ہے

یعنی اس کی محنت اس کے بنیادی وجود کی ملکیت نہیں ہوتی، بل کہ سرمایہ دار کی ملکیت ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ کام کے دوران اپنی ذات کا اقرار نہیں کرتا بل کہ اس کی نفی کرتا ہے۔ وہ اپنی جسمانی اور ذہنی توانائی کو آزادانہ فروغ نہیں دیتا بل کہ اپنے جسم کی تحقیر اور دماغ کا زیاں کرتا جاتا ہے۔ اُس کی محنت اپنی مرضی سے نہیں ہوتی بل کہ جبری ہوتی ہے۔ اس محنت سے اس کی کسی ضرورت کی تسکین نہیں ہوتی بل کہ وہ فقط ذریعہ ہوتی ہے، دوسرے (سرمایہ دار) کی عیاشیوں کی تسکین کا۔

2۔ اپنی پیدا کردہ چیزوں سے بیگانگی: جس رفتار سے پیداوار کی مقدار اور حلقہء اثر میں اضافہ ہوتا ہے اُسی رفتار سے محنت کار کا افلاس بڑھتا ہے۔ وہ جتنی زیادہ چیزیں پیدا کرتا ہے، اتنا ہی وہ خود بہ حیثیت بازاری جنس کے سستا ہوتا جاتا ہے۔ انسان کی ناقدری بہ راہِ راست اُسی نسبت سے بڑھتی ہے جس نسبت سے اشیا کی قدر میں اضافہ ہوتا ہے۔ زندگی سستی اور چیزیں مہنگی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محنت کی پیداوار محنت کار کی دشمن بن کر اُس کے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ وہ اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کا غلام ہو جاتا ہے۔

صرف یہ نہیں ہے کہ چیزوں کی دنیا انسان کی حکم ران بنتی ہے، بل کہ یہ بھی ہے کہ انسان جو سماجی اور سیاسی حالات پیدا کرتا ہے، وہی اس کے مالک بن جاتے ہیں۔ اُن چیزوں کی مضبوطی، جو ہم خود پیدا کرتے ہیں، جو ہمارے اوپر ایک قوت بن جاتی ہے، ہمارے کنٹرول سے بڑھ جاتی ہے، ہماری توقعات کو ادھورا کرتی ہے، ہماری کیلکولیشنز کو صفر پر لاتی ہے..... یہ اب تک کی تاریخی ترقی میں اہم ترین عناصر میں سے ایک ہے۔ بے گانہ شدہ آدمی، جو سمجھتا تھا کہ وہ نیچر کا مالک ہو چکا ہے مگر وہ چیزوں اور حالات کا غلام بن گیا، ایک ایسی دنیا کا دُم چھلا بن گیا جو بہ یک وقت اُس کی اپنی قوتوں کا منجمد اظہار ہے۔

محنت کار جتنی محنت صرف کرتا ہے اور اس کی تخلیق کردہ معروضی دنیا جتنی طاقت ور ہوتی جاتی ہے، اس کی ذات، اس کی باطنی دنیا اتنی ہی مفلس اور قلاش ہوتی جاتی ہے۔ محنت کار پیداوار میں اپنی جان کھپا دیتا ہے لیکن یہ جان اس کی ملکیت نہیں رہ جاتی بل کہ پیداوار کی ملکیت بن جاتی ہے۔ پیداوار جتنی بڑھتی جاتی ہے، محنت کار کی معروضی محرومی بھی اتنی ہی بڑھتی ہے۔

محنت کار کو نہ تو پیداوار کی نوعیت متعین کرنے کا حق ہوتا ہے، اور نہ کام کے حالات، کام کرنے کی جگہ اور نہ پیداوار کی تقسیم میں اُس کا کوئی دخل ہوتا ہے۔ اس کو اپنی زندگی پیداوار کے تقاضوں کے سانچے میں ڈھالنی پڑتی ہے۔

اور یہ حکم رانی انسان پہ خود اس کے اپنے ہاتھوں کی بنائی پراڈکٹس کی حکم رانی ہوتی ہے۔ مشینری انسان کی کم زوری بڑھاتی جاتی ہے، کم زور انسان کو ایک مشین میں بدلنے کو۔

جوں جوں پرائیویٹ پراپرٹی اور تقسیمِ محنت بڑھتی ہے، مزدور کی قوت کے اظہار کا اپنا کیریکٹر گم ہوتا جاتا ہے۔ مزدور اور اس کی پراڈکٹس انسان، اس کے ارادے اور اس کی منصوبہ بندی سے الگ وجود اختیار کرتے ہیں۔ محنت سے پیدا کردہ پراڈکٹ، اب ایک بیگانے وجود کے بہ طور اس کے خلاف کھڑا ہو جاتا ہے، ایک قوت کے بہ طور اپنے پیدا کرنے والے سے آزاد۔ پیداواری سرگرمی ایک بے گانہ شدہ سرگرمی بن جاتی ہے۔

وہ پیداوار کا فیصلہ نہیں کرتا بل کہ پیداوار اُس کی زندگی کا فیصلہ کرتی ہے۔ پیداوار حاکم ہوتی ہے اور وہ محکوم۔ پیداوار آقا ہوتی ہے اور وہ اس کا غلام۔ یعنی مُردے زندوں پر راج کرتے ہیں۔

3۔ دوسرے انسانوں سے بیگانگی: اپنی محنت سے بیگانگی، اپنی محنت کی پیداوار سے بے گانگی اور اپنے آپ سے بیگانگی کا بہ راہِ راست نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دوسرے انسانوں سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔ وہ اُن کی محنت سے بھی، ان کی محنت کی پیداوار سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔ انسان جب خود سے اور اپنی ذات سے بیگانہ ہو جاتا ہے تو وہ لامحالہ طور پر دوسرے انسانوں سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔

انسان اپنے معاشرے، اپنی تہذیب، اپنی ذات، سب کو بیگانہ اور غیر سمجھنے لگتا ہے۔ اس کو اپنے گرد و پیش کی ہر شئے اجنبی اور غیر نظر آتی ہے اور وہ معاشرے کی تمام قدروں اور سرگرمیوں کو بے معنی سمجھنے لگتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں کی بستی میں بھی اپنے آپ کو تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کرتا ہے۔ اس کی دوسری علامت لاچاری اور بے بسی کا شدید احساس ہے۔

مطلب ہر آدمی دوسروں سے بیگانہ ہے اور یہ کہ اسی طرح دوسروں میں سے ہر ایک انسانی زندگی سے بیگانہ ہے۔ لوگ تنہا پسند ہو جاتے ہیں، تقسیم ہوتے جاتے ہیں، وہ دوسرے قریب ترین شخص کو بھی ہم درد کے بجائے مخالف کے بہ طور دیکھتے ہیں۔ (اس کا یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ بیگانہ شدہ لوگ اپنے مشترکہ مسائل کے اجتماعی حل کی طرف بہت کم دھیان دیتے ہیں)۔

4۔ بشری زندگی سے بیگانگی: کپٹلزم کے اندر بیگانگی ذات کا چوتھا شکار انسان کی بشری زندگی ہے۔ انسان کا نوعی کردار اس کا بااختیار آزاد اور شعوری عمل ہے اور یہی خصوصیت اس کو دوسرے جانوروں کی نوعی زندگی سے ممتاز کرتی ہے۔

انسان کا نوعی وجود کھڑا ہی اس بات پہ ہے کہ وہ نئی دنیا تعمیر کرتا جائے۔ نیچر کو تخلیقی طور پر استعمال کرے مگر بیگانگی انسان کے اس شعوری حیاتی عمل یعنی نوعی زندگی کا سارا نظام درہم برہم کر دیتی ہے۔ اس کی نوعی زندگی دوسرے جانوروں کی نوعی زندگی کی سطح پر آ جاتی ہے۔ وہ صرف جینے کے لیے پیدا کرتا ہے جو جانوروں کی نوعی خصوصیت ہے۔

کپٹلزم کے بطن سے ''بازاری معاشرہ'' جنم لیتا ہے۔ دوسرے لوگ کس طرح زندگی گزارتے ہیں، اس سے کسی کو سروکار نہیں۔ بیگانگی میں ڈوبے فرد کے لیے اب یہ جہاں دوسروں کی ہے، وہ اس میں بالکل فٹ نہیں ہے۔

بیگانہ شدہ آدمی انسانیت کے اصل جوہر سے بیگانہ ہے، اپنی ''species being'' سے بیگانہ ہے، اپنی نیچرل اور روحانی خصوصیات دونوں سے بیگانہ۔ انسانی essence سے بیگانگی ایک وجودی انانیت پسندی کی طرف لے جاتی ہے۔

وہ لذتِ عمل سے بیگانہ اور عزم و عمل سے بے زار ہو جاتے ہیں۔ اُن سے ہر جذبہ اور ولولہ چھن جاتا ہے۔ ایسے معاشرے کے لوگ ہر بیداد اور ظلم سہنے کے عادی بنتے ہیں۔ وہ ظالم اور جابر قوتوں کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں اور ذلت کو اپنا مقدر سمجھ لیتے ہیں۔

انسان فطرت پہ زندہ رہتا ہے۔ اگر اُس نے صفحۂ ہستی سے مٹنا نہیں ہے تو اسے نیچر کے ساتھ ہر حالت میں interchange میں رہنا ہوتا ہے۔ انسان کی فزیکل اور سپر چوئل زندگی نیچر

کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔اس کا مطلب ہے نیچر خود اپنے ساتھ جڑی ہوئی ہے، اس لیے کہ انسان نیچر کا حصہ ہے۔مگر بیگانہ شدہ آدمی (مزدور طبقہ) اب نیچر سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔اسے ماحولی آلودگی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔اسے ایسڈ رین سے، گرین ہاؤس گیسز سے، زمین کا ٹمپریچر بڑھنے پہ کوئی تشویش نہیں ہوتی۔

بیگانگی کا مارا شخص جانوروں سے بھی گر جاتا ہے۔وہ بُت پرستی شروع کرتا ہے۔بُت جو خود انسان کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے ہیں .....بُت، چیزیں ہیں اور انسان اُن چیزوں کے سامنے جھکتا ہے اور اُن کی عبادت کرتا ہے۔وہ اس کی عبادت کرتا ہے جسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا۔اس طرح کرتے ہوئے وہ خود کو ایک چیز میں ڈھال دیتا ہے۔

انسان جتنا زیادہ اپنی قوتوں طاقتوں کو بتوں میں ٹرانسفر کرتا جاتا ہے، وہ خود کو اتنا ہی بے چارہ تر بناتا جاتا ہے اور وہ بتوں پہ بہت زیادہ انحصار کرتا جاتا ہے تاکہ وہ اسے اس چیز کا ایک چھوٹا حصہ واپس لینے کی اجازت دیں جو کہ ابتدائی طور پر تھا ہی اسی کا۔یہ بت کیا ہیں؟ یہ ہیں: ریاست، چرچ، اسی طرح کوئی ایک مشکل کشا سردار، لیڈر، یا شخصیت (ہیرو پرستی)۔

*****

بیگانگی اُن لوگوں کی فریاد ہے جو خود کو قابو سے باہر اندھی معاشی قوتوں کا شکار محسوس کرتے ہیں۔یہ عام لوگوں کی فرسٹریشن ہے جو فیصلہ کرنے کے پراسیس سے باہر رکھے گئے ہیں۔مایوسی اور بے بسی کا احساس جو کہ اُن لوگوں میں سرایت کرتا ہے جو جواز کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں خود اپنی منزل متعین کرنے یا شکل دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

کیپٹلزم کے اندر موجود بحران کو کووڈ 19 جیسی وبائیں اور بلوچستان میں 2022ء جیسے تباہ کن سیلاب وآفات سنگین تر بناتی ہیں۔یوں بیگانگی بڑھ جاتی ہے، سماجی نابرابری سنگین ہو جاتی ہے، خودغرضی وسیع ہوتی ہے۔اس بیگانگی نے قدامت پسند الٹرا رائٹ کے پراجیکٹ کے حق میں انسانوں کو غیر سیاسی بنانے کو بہت تقویت دی، انتہا پسند اور فاشسٹ تصورات کی پرورش کی۔

بیگانگی محض ایک فلاسوفیکل تصور نہیں ہے۔یہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ہم اپنی انسانی

سرگرمی کو ایک بیرونی، اجنبی اور خود سے دشمنانہ ماحول کے کنٹرول میں پاتے ہیں جس سے ہمارے جسم اور دماغ پہ منفی اثرات پڑ رہے ہوتے ہیں۔یہ بیگانگی ایک ایسے معاشی نظام (کیپٹلزم) کا نتیجہ ہوتی ہے جہاں نیچر، دوسرے لوگ اور وہ خود اپنے آپ سے اجنبی رہتے ہیں۔

اس موضوع کو سمجھنے کے لیے ایک بڑے فلاسفر کا یہ ایک فقرہ ہی کافی ہوگا:

''نوع انسان کی تاریخ، انسانی کی بڑھتی ہوئی ترقی کی تاریخ ہے، اور بہ یک وقت بڑھتی ہوئی بیگانگی کی تاریخ ہے۔''

سوال یہ ہے کہ انسان اس بیگانگی ذات اور اشیا کی غلامی سے چھٹکارا کیسے پائے؟ اُس کی انسانی معنویت اور بشری قدریں بحال کیسے ہوں؟

بات صرف ورکنگ کلاس کی آزادی کی نہیں ہے بل کہ سارے انسانوں کی آزادانہ سرگرمی کے ذریعے کُل انسان کی نجات کی بات ہے اور ایک معاشرہ جس میں انسان، نہ کہ چیزوں کی پروڈکشن مقصد ہو۔جس میں انسان کا ایک مفلوج عجیب الخلقت ہونا ختم ہو جائے اور وہ مکمل طور پر ایک ترقی یافتہ انسان بن جائے۔

بیگانگی پہ قابو پانے کا ایک ہی راستہ ہے: چیزوں کو ٹرانسفارم کرنا جس طرح کہ لوگ اپنی محنت کو منظّم کرنا چاہئیں۔لوگوں کے خیالات تعلیم، تبلیغ، پروپیگنڈا، ماہر نفسیات کے سیشنز کے ذریعے تبدیل کرنا بے سود ہے جب تک کہ بہ یک وقت اُن حالات کو بدل نہ دیا جائے جس میں وہ رہ رہے ہیں۔مزدوروں کو اُن کے ورک پلیس کے اندر سیاسی اقتدار ٹرانسفر کرنا۔

مارکس کے ہاں سوشلزم کا تصور ہی بیگانگی سے نجات ہے۔

اخلاقی بحران:

کیپٹلسٹ سماج پچھلے فیوڈل سماج کی عظمت، بزرگی اور سفید پوشی کی داڑھی نوچ کر مستحکم ہوا ہے۔لازم بھی یہی تھا کہ وہ اپنے سے پچھلے فیوڈل سماج کی اخلاقیات، رسوم ورواج اور طرزِ زندگانی کی دستار روند کر اپنا اقتدار مضبوط کرے۔

کیپٹلزم میں سب کچھ کا محور اب شخص اور فرد ہو گیا۔ ''ہم قبیلوی''، ''ہم وطنی''، ''ہم مذہبی'' سب کچھ ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ چرچ کم زور ہوا۔ پوپ، 18 ویں ترمیم والے صدرِ پاکستان سے بھی کم زور ہو گیا اور سٹیٹ چرچ اور سجادہ نشین سے آزاد ہو کر واحد قوت کے بہ طور ابھر آیا۔ سٹیٹ میں فرد کو قانون کے سامنے برابری، آزادیِ تحریر و تقریر و تنظیم سازی جیسی آزادیاں نصیب ہوئیں۔

عصمت فروشی

جدید کیپٹلزم میں رنڈی بازی اور سیکس ٹریڈ کے صنعت بن جانے سے کھرب ہا ڈالر کی گلوبل مارکیٹ پیدا ہوئی۔ اس میں ملینوں عورتوں کو شامل کیا گیا جو قومی اور گلوبل معیشتوں کا بہت بڑا حصہ بناتی ہے۔

اب Pimps کو معزز برنس لوگوں میں شمار کر کے روٹری کلب میں شامل ہونے دیا گیا۔ چکلے کی رنڈی بازی کو قانونی بنا دیا گیا اور آسٹریلیا، ندرلینڈ، جرمنی اور نیوزی لینڈ جیسے ممالک میں ایک ''مارکیٹ سیکٹر'' قرار دیا گیا، لباس اتار کر ڈانس کرنا (Stripping) اب ''Leisure'' یا ''انٹرٹین منٹ انڈسٹری'' کا باقاعدہ حصہ بنا، اور پورنوگرافی جنرل موٹرز جیسی کارپوریشنوں کے لیے کافی معزز بنی۔ ایسی کارپوریشنوں نے پورن چینلوں کو اپنے کاروبار کا حصہ بنایا۔ جب کہ اِس دوران رنڈی بازی کی صنعت کا ایک حصہ لیگل، معزز اور منافع بخش مارکیٹ سیکٹر بنا۔

رنڈی بازی کی بہت بڑی اکثریت منظّم جرائم کے لیے ایک سب سے منافع بخش سیکٹر رہا۔(1)

ریفرنسز

1۔ شیلا جیفری۔ انڈسٹریل وجائنا۔ 2009ء۔ Roultiedge، لندن۔ صفحہ 2

کلاسز اور کلاس سٹرگل

کلاس 'لوگوں کا ایک گروپ ہوتا ہے جو اپنے معاشی مفادات کے سبب سماج کے دوسرے گروپوں سے مختلف ہو۔ کیپٹلزم میں دو شرائط پر دو وسیع گروپ موجود ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے مندرجہ ذیل فرق رکھتے ہیں:

1۔ ذرائع پیداوار کی ملکیت کس کی ہے؟

2۔ دوسرے لوگوں کی محنت پہ کنٹرول کس کا ہے؟

طبقے دو طرح کے ہوتے ہیں: بنیادی طبقے اور غیر بنیادی طبقے۔

بنیادی طبقات

ایک طبقاتی سماج، دو بڑے متصادم کیمپوں میں منقسم ہے جو سیدھا سیدھا ایک دوسرے کے مقابل اور برسرِ پیکار ہیں۔ یعنی وہ جو ذرائع پیداوار اور دوسروں کی محنت کا مالک ہو اور وہ جس کے پاس اپنی محنت بیچنے کے علاوہ کچھ بھی نہ ہو۔ یہ دونوں بنیادی طبقات کہلاتے ہیں۔ اس لیے کہ سماج کے اندر پیداواری عمل میں یہی دو طبقات لازم و ملزوم ہیں۔ باقی جتنے بھی لوگ ہیں وہ اِن دو بنیادی طبقات میں نہیں آتے۔ اگر اِن دونوں میں سے ایک طبقہ نہ ہو تو نظام 'طبقاتی'' رہے گا ہی نہیں۔

یہ دونوں بنیادی کلاسز یہ ہیں:

1۔ بورژوازی: فرانسیسی زبان کا لفظ۔ مڈل ایجز میں چار دیواری والی فصیل کے اندر چھوٹے سے ''مارکیٹ قصبے'' کے رہنے والوں کو بورژوازی کہتے تھے جو آس پاس پھیلے دیہی کاشت کاروں سے معاشی طور پر ایک قدم آگے ہوا کرتے تھے۔

کیپٹلزم کے اندر سرمایہ دار یا کیپٹلسٹ کلاس کو ''بورژوازی'' بھی کہتے ہیں۔ ذرائع پیداوار کی ملکیت اس کے قبضے میں ہے اور دوسروں کی محنت بھی وہی خریدتا ہے۔

2۔ پرولتاریہ: فرنچ زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے: شہریوں کا سب سے نچلا طبقہ۔ کیپٹلزم کے اندر دوسرا بنیادی طبقہ یہی مزدور یا ورکنگ کلاس ہے اور یہ ایک ایسی کلاس ہے جس کے پاس ذرائع پیداوار کی ملکیت نہیں ہے۔ یہ دوسروں کی محنت بھی نہیں خرید سکتا۔ یہ تو اپنی محنت بیچ کر اپنی روزی کماتا ہے۔

بورژوازی طبقہ اور پرولتاریہ طبقہ میں اول الذکر ظالم ہوتا ہے اور دوسرا مظلوم طبقہ۔ پہلا حاکم طبقہ ہوتا ہے اور دوسرا محکوم طبقہ۔ پہلا طبقہ لوٹنے والوں کا ہوتا ہے اور دوسرا لُٹ جانے والا۔

ظاہر ہے دونوں کے مفادات ایک جیسے نہیں ہوتے اور اُن میں زبردست تضاد رہتا ہے۔ چوں کہ یہ تضاد بورژوازی اور پرولتاریہ پر مشتمل دو کلاسز کے درمیان ہے، اس لیے اِسے ''کلاس تضاد'' کہتے ہیں۔

یہ دونوں طبقات بنیادی طبقات، معاندانہ طبقات یا مخاصمانہ طبقات بھی کہلائے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے معاشی مفادات میں بنیادی اختلافات ہیں اور اِن بنیادی تضادات کے بیچ کوئی میڑھ مرکہ، کوئی جرگہ عدالت اور کوئی مصالحت و جنگ بندی ممکن نہیں ہوتی۔ یہ جنگ دونوں فریقوں میں سے ایک کی پرولتاری طبقے کی حتمی فتح اور بورژوازی کی مکمل اور حتمی شکست پر ہی حل ہوتی ہے۔

غیر بنیادی طبقات

معاشرے میں انسانوں کے بیچ کلاس تضاد کے علاوہ دیگر امتیازات بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً قومیت، جنس، عمر، پیشے، تعلیم، وغیرہ اور کبھی کبھی استثنائی طور پر ایک یا بہت سے غیر بنیادی تضادات اس قدر نمایاں ہو جاتے ہیں کہ بالکل بنیادی تضاد کا رول ادا کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً بلوچ قومی تضاد لیکن استثنا کو چھوڑ کر اصولی بات یہ ہے کہ کلاس تضاد سماج کا اہم ترین تضاد ہوتا ہے۔ باقی ساری سماجی تہیں اور پرتیں اور ان کے بیچ تضادات غیر بنیادی ہوتے ہیں۔

کیپٹلزم میں پچھلے سماج یعنی فیوڈلزم کے باقیات موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً کسان طبقہ۔ جو فیوڈلزم میں تو بنیادی طبقہ ہوتا تھا مگر اب کیپٹلزم میں نہیں مگر یہ پرولتاریہ کلاس کا اتحادی ہوتے ہیں۔

یہ غیر بنیادی طبقات، بنیادی دو طبقات میں سے کسی نہ کسی کا ساتھ دیتے ہیں۔ مگر ایسا وہ صرف اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے کرتے ہیں۔ بنیادی طبقات یعنی پرولتاریہ اور بورژوازی میں جو بھی طاقت ور ہوتا ہے، یہ غیر بنیادی طبقات اسی کا ساتھی بن جاتے ہیں۔

انٹیلی جنشیا، انجینئر، وکیل، ڈاکٹر، ٹیچر اور سائنس دان پر مشتمل پرت نہ تو ایک الگ کلاس رہا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ سماجی پیداوار کے نظام میں کوئی آزادانہ پوزیشن نہیں رکھتا۔ اس سماجی سیکشن کی سرگرمیوں کو اُسی بنیادی طبقے کے مفادات مقرر کرتے ہیں جس کی یہ خدمت کرتا ہے۔ بینک مالکان، فوج، پولیس اور افسر شاہی پیداواری عمل سے دور رہتے ہیں۔ اس لیے وہ بنیادی طبقات نہیں ہوتے۔ وہ مزدوروں پر جونک لوگ ہیں۔

انٹیلی جنشیا کیپٹلزم کی خدمت کرتا ہے، اس لیے وہ مزدور طبقہ اور اس کی جدوجہد سے دور رہتا ہے۔ اس نام نہاد ''مڈل کلاس'' کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ یہ کلاس نہیں بس ایک Stratum ہے۔ یہ لازمی طور پر بہت جلد منتشر ہو جاتے ہیں۔ بعض دائیں مڑ کر انقلاب دشمن صفوں میں جا ملیں گے۔ البتہ اس پرت میں سے بعض افراد اپنے علم و دانش کو مزدور طبقے کو شعور دینے اور انھیں منظّم کرنے میں لگا لیتے ہیں۔

ان کے لیے خود مختار رہنے کی کوئی گنجائش موجود نہیں۔

پرولتاریہ کی بغاوت اور بورژوازی کی مزاحمت

میں نے جان بوجھ کر ''مزاحمت'' کپٹلسٹ کے ساتھ جوڑ دی۔ منافع کی بیماری کو جاری و ساری رکھنا بورژوازی کا جواز اور اُس کی عادت وخصلت بن جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس میں کسی قسم کی ''مداخلت'' برداشت کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ چناں چہ اُس کا نظام یعنی کپٹلزم سرمایہ کی اس ریل پیل میں کسی رکاوٹ کی مزاحمت کرتا ہے اور یہ کام وہ طریقوں سے لے کر ہلاکت آمیز اقدامات سے کرتا ہے۔

مثلاً بورژوازی' مزدوروں کی اپنی اجرتیں بڑھانے کے مطالبات کی راہ روکنے کا راستہ یہ نکالتی ہے کہ وہ بے روزگاروں کی ایک رجمنٹ پیدا کر دیتی ہے تاکہ جب مزدور اپنی اجرت کم ہونے پہ کام سے انکار کر دے تو اُس ایک کی جگہ پُر کرنے کے لیے دوسو مزدور لائن بنائے موجود ہوں۔ روزگار کے لیے منتظر اِس لشکر کو ''ریزروڈ انڈسٹریل آرمی'' کا نام دیا گیا ہے۔

لہٰذا ایک استاد کے بہ قول ''کام کی بھیک مانگنے کے لیے پھیلے ہوئے بازوؤں کا جنگل موٹا ہوتا جاتا ہے، جب کہ خود بازو لاغر ہوتے جاتے ہیں۔''

مزدور نہ صرف خود کو ایک دوسرے سے سستا بیچنے کا مقابلہ کرتے ہیں بل کہ ایک آدمی 5، 10 یا 20 مزدوروں کا کام کرنے کا مقابلہ بھی کرتے ہیں۔

اسی طرح کپٹلسٹ مزدوروں کے اندر سے ایک خوش حال طبقہ پیدا کرتے ہیں اور پھر اُن کے ذریعہ ٹریڈ یونینوں میں اپنا اثر اور رسوخ قائم کرتے ہیں۔ ایسے ٹریڈ یونین لیڈر اور پیٹی بورژو اعناصر مزدور تحریک میں انتشار پھیلانے کا باعث بنتے ہیں اور مزدور تحریک میں موقع پرستی لاتے ہیں۔ مزدور تحریک میں موقع پرستی کا مطلب سرمایہ داروں سے مفاہمت کرنا اور مزدوروں کو کپٹلزم کے خلاف جدوجہد سے باز رکھنا ہے۔ یہی عناصر سرمایہ داروں کے اقتدار کو قائم رکھنے کا باعث بنتے ہیں۔

سرپلس ویلیو کا ''ون وے ٹریفک'' اپنے مخالفین کے لیے ہمہ وقت ننگی تلوار بنے جاری رہتا ہے۔ یہ مخالف کو تہس نہس کرتا ہے۔ کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا کہ جتنے قتل منافع نے کیے ہیں،

روئے زمین پہ اُتنے قتل زلزلوں، سیلابوں، وباؤں اور قحطوں نے مل کر بھی نہیں کیے۔

بہت تلخ موت دیتا ہے سرپلس ویلیو کا نظام۔ یہ انسانیت کا ہر دم الرٹ، ہر لمحہ ہشیار اور ہر وقت خبردار دشمن ہے اور یہ دیکھنے میں خواہ جتنا رنگین اور دل پذیر ہو، ہر وقت ظاہر داری کی خوشبوئیں بکھیرتا ہو، اور مہذب وشائستہ بولتا ہو مگر یہ اپنے تحفظ کے لیے تصور سے بھی بڑھ کر سفاک ہوتا ہے۔

آپ کسی بھی بھیس میں ہوں، آپ اپنے نعروں ناموں جھنڈوں کو خواہ جتنا چاہیں مدہم اور مبہم رکھیں، یہ آپ کو پہچان لے گا۔ اس کی شناخت کی نظر، سماعت اور سونگھنے کی حسیات والے ریڈار آپ کو سرعت کے ساتھ تلاش کر لیتے ہیں، شناخت کرتے ہیں اور ٹھکانے لگاتے ہیں۔

نظریاتی یا فلسفیانہ بات تو چھوڑیے، یہ نام نہاد اخلاقی ضروریات کے سبب سے بھی اپنے نظام میں تبدیلیاں کرنے نہیں دیتا۔ ''وطن پرستی'' کے نام پر اِس نظام کو ایک چھوٹے جغرافیائی خطے تک محدود رکھنے کی بات سوچنا اُس کے خلاف سنگین غداری ہے۔ ''ملکی مفاد'' کے نام پر اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوئی بھی کوشش موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

مالک طبقات وعظ سے، تقریر سے، اللہ کے واسطے دے کر، ایک ہی قوم یا قبیلے سے متعلق ہونے کے حوالے دے کر یا' یاری دوستی میں اس بات پہ قائل نہیں کیے جاسکتے کہ وہ بھوکے اور مفلس عوام الناس کی خاطر ملکیت اور حکم رانی سے رضا کارانہ طور پر دست بردار ہو جائیں۔ وہ انسانیت اور انسانی بھائی چارے کے طفیل یا ہم مذہب اور ہم وطن اور ہم قوم ہونے کے محابے سے یہ سب کچھ ترک نہیں کریں گے۔ تاریخ اور قوموں کے تجربے بتاتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ سرپلس ویلیو ہی نظریہء ضرورت ہے، سرپلس ویلیو ہی جئے ہند ہے، نظریہء پاکستان ہے، یہی حب الوطنی ہے اور یہی مذہب دوستی ہے۔ اس نظام میں black life matters جیسے پاپولر نعرے بہ ذاتِ خود جارج فلوئڈ کی گردن دبوچ لیتے ہیں۔ یہ ایک ایسا ہمہ گیر نظام ہے جس کا اپنا سیاسی، اخلاقی اور فلاسوفیکل سسٹم ہے۔ یہ کسی اور نظام کو مانتا ہی نہیں۔ سب نظام اِس میں مدغم۔

کپٹلزم مقامی کے ساتھ ساتھ ایک عالمی نظام ہے؛ معاشی طور پر بھی، سیاسی طور پر بھی اور نظریاتی وفوجی طور پر بھی۔ امریکا اور مغربی یورپ اس نظام کی قیادت کر رہے ہیں۔ اس سب کچھ

کوالٹ دینے کے لیے مزدور طبقہ مقامی طور پر بھی اور عالمی پیمانے پر بھی تحریک چلائے ہوئے ہے۔ ملٹی نیشنلز کے خلاف اور کیپٹلزم کے خلاف مزدوروں کی یہ عالمی تحریک سوشلزم کی تحریک کہلاتی ہے۔

کیپٹلزم عالمی طور پر دنیا بھر کی انقلابی تحریکوں کے لیے دشمنی کے جذبات میں گندھا ہوتا ہے اور یہ نظام اپنے بے پناہ وسائل، ملٹری قوت، جاسوسی جال اور سازشوں سے لیس دنیا کی ہر انقلابی تحریک پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

تاریخ میں صرف ایک ہی نظام ایسا آیا تھا جو صحیح معنوں میں اس بین الاقوامی کیپٹلزم کے سامنے کھڑا ہو پایا تھا اور اُسے کئی بار تہس نہس بھی کر ڈالا تھا۔ وہ متبادل نظام سوویت یونین اور دیگر 22 سوشلسٹ ممالک کا سوشلزم کہلاتا ہے۔ سوشلزم 70 برس تک کیپٹلزم کی جڑیں اور بنیادیں تباہ کرتا رہا۔ مگر اِن ساری کوششوں کے باوجود کیپٹلزم ایک بار پھر زندہ بچنے میں کامیاب ہوا۔

سوشلزم والا یہ متبادل نظام بار بار آئے گا۔ کہیں کامیاب، کہیں ناکام۔ اُس متبادل نظام کا خیال ہے کہ کیپٹلزم کو قدرتی موت نہیں آنی بل کہ اسے قتل کی موت مارنا پڑتا ہے۔ یعنی کیپٹلسٹ رشتے خود بہ خود ختم نہیں ہوتے، کسی نے انھیں ختم کرنا ہوگا۔

کلاس سٹرگل کی صورتیں

محروم مزدور طبقے کے پاس خود کچھ کرنے کے بغیر کوئی راستہ نہیں رہتا۔ اُسے خود ہی اپنی نجات کے لیے سٹرگل کرنی ہوتی ہے۔ اُس کے لیے تین طریقے کے سٹرگل موجود ہیں:

1۔ معاشی سٹرگل

یہ مزدوروں اور اُن کی یونین کی روزمرہ کی جدوجہد ہے تاکہ مزدور کی اجرتیں بڑھیں، اُس کے کام کے حالات بہتر ہوں۔ انسانی تاریخ، اپنی حالت بہتر بناتے رہنے کی تدابیر کی تاریخ رہی ہے۔ فرسودگی کے زمانوں سے لے کر آج کی ترقی یافتہ دنیا تک یہی سلسلہ رہا ہے اور یہ سلسلہ بے انت ہے، بے کراں، لازوال اور ابدی ہے۔ سٹرگل کی یہ قسم بورژوازی کی نجی ملکیت کو چیلنج نہیں کرتی۔ مزدور ٹریڈ یونین میں منظم ہو کر بس آنے ٹکے کی لڑائی لڑتے ہیں۔

یہ لازمی جدوجہد اصل نجات نہیں دیتی۔ یہ کیپٹلزم کو ختم نہیں کرتی۔ ورکنگ کلاس خود اپنی کوششوں سے محض ٹریڈ یونین شعور پیدا کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ ہر ہڑتال میں سماجی انقلاب کے عناصر پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن یہ سوچنا حماقت ہوگی کہ ہم ہڑتال سے بہ راہِ راست انقلاب کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔

اگر صرف یہی صورت رہے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ مزدور کی غلامی ابد تک رہے گی۔ بس چھوٹی موٹی رعایتیں ملتی رہیں گی۔ ٹریڈ یونین سٹرگل میں مزدور طبقاتی طور پر باشعور تو ہوسکتا ہے۔ مگر حتمی آزادی حاصل نہیں کرسکتا۔ ٹریڈ یونین کمیونسٹ پارٹی نہیں ہوتی۔ مزدور، خود روطور پر اپنے حاکموں کا تختہ الٹنے کے قابل نہیں ہیں۔ مزدور ٹریڈ یونین تو بنا سکتے ہیں، عمومی سیاسی تحریک کو تقویت تو دے سکتے ہیں مگر یہ سارے کام انہیں آٹو میٹک طور پر سیاسی پارٹی نہیں بناتے۔

ایک اور غضب لینن کے وقت یعنی 1903ء سے لے کر آج تک یہ رہا کہ ٹریڈ یونین لیڈروں کو بورژوازی نے کرپٹ بنایا اور وہ خود پیٹی بورژوازی بن چکے ہیں۔

بنیادی نجات کے لیے تو اُسے اس طریقے کو بھی جاری رکھنا ہوگا اور ساتھ ساتھ اپنے لیے دوسری راہیں بھی تلاش کرنی ہوں گی۔ یعنی:

2۔ نظریاتی سٹرگل

طبقاتی جدوجہد کی سیاسی اور معاشی صورتیں اُس وقت تک مدہم اور مبہم ہی رہتی ہیں جب تک کہ انھیں نظریات کی قطب نما میسر نہ ہو۔ نظریاتی سٹرگل کا مطلب بورژوازی کے نظریات کی استرداد اور اُس کا متبادل، عوامی نجات کا نظریہ فراہم کرنا ہوتا ہے۔

نظریہ کی فراہمی اس لیے ضروری ہے کہ جس وقت تاریخ میں پیداوار کے آلات ابتدائی اور فرسودہ صورت میں تھے تو انسان کو سماج کا شعور ہی نہ تھا۔ ابتدائی انسان جو کچھ دیکھ اور سمجھ سکتا تھا، اُسی کے بہتر بنانے کو پورے معاشرے کا بہتر بنانا گردانتا تھا۔ چناں چہ کسی نے کلچر کے بہتر بنانے کو سماج کا بہتر بنانا سمجھا، کسی نے خواتین کی حالت میں اصلاح کرنے کو اور زیادہ تر نے تو اخلاقیات کو۔ سماج کو مجموعی طور پر نہیں بل کہ ٹکڑوں میں بہتر بنانے والے اِن سارے فلاسفروں کو ''یوٹوپیائی''

فلاسفر کہتے ہیں۔

اس کے برعکس آج مزدوروں کا نظریہ ہمہ پہلو ہے۔ یوٹو پیائی کے برعکس ہے۔ اسے مارکسزم کہتے ہیں۔

3۔سیاسی سٹرگل

یہ ہے اصل جدوجہد۔ مقصد استحصالی نظام کو جڑ سے ہی ختم کرنے کی جدوجہد۔ یہاں صرف اجرتوں میں اضافے یا حالاتِ کار میں بہتری کی بات نہیں کی جاتی بل کہ مہنگائی، بے روزگاری، بے امنی، بے انصافی، اور بے جمہوریتی کے خلاف بات کرتے کرتے سیاسی اقتدار کا سوال اٹھایا جاتا ہے۔اس نتیجے پر پہنچا جاتا ہے اقتدار بورژوازی سے لیا جائے اور پرولتاریہ کے حوالے ہو۔

کلاس سٹرگل کی سیاسی شکل ورکنگ کلاس اور ساری سوسائٹی کو استحصال سے نجات دلانے کے لیے فیصلہ کن شرط ہے۔

سٹرگل کی معاشی اور نظریاتی صورتیں سیاسی سٹرگل کے اہداف کے ماتحت ہوتی ہیں۔

سیاسی پارٹی

یہ دولفظوں پر مشتمل ایک بہت ہی طاقت ور مظہر ہے: سیاست اور پارٹی۔

سیاست کسی بھی سماج میں سب سے ارفع سماجی سرگرمی ہے۔ یہ محض ایکٹوازم کا نام نہیں ہے بل کہ یہ خود کو آگاہ اور باخبر رکھنا بھی ہے، حقائق کی پروا کرنا بھی ہے اور تبدیلی کے لیے کام کرنا بھی ہے۔ سیاست زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہے۔

پارٹی ایک تنظیم ہوتی ہے جس میں سیاسی ہم فکر جمع ہوتے ہیں۔ تنظیم میں خود کو پرو دینے والے یہ لوگ اپنے طبقے کے مفاد کی رکھوالی کرنے والے بہت باخبر اور باشعور عناصر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے طبقے کے مفادات بیان کرتے ہیں اور اُن کی رہ نمائی کرتے ہیں۔

آج کے انسان کی بہت بڑی اکثریت بین الاقوامی کیپٹلزم کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ اس کیپٹلزم میں دو ''بنیادی'' طبقات ہوتے ہیں: پرولتاریہ اور بورژازی۔ اِن دونوں باہم متصادم طبقات کی سوچ، منشور اور تنظیمیں بہت مختلف ہوتی ہیں۔

بالائی اور حکم ران طبقات کی سیاسی پارٹی کا جو بھی نام ہو، وہ بورژوا سیاسی پارٹی ہوتی ہے اور نچلے محکوم محنت کش طبقے اور محکوم قوموں کی سیاسی پارٹی خواہ جس نام سے کام کرتی ہو، وہ پرولتاریہ کی پارٹی ہوتی ہے۔

1۔ بورژوا سیاسی پارٹی

ایسی سیاسی پارٹی کی جو منافع اور جائیداد کی حفاظت کرتی ہو۔

ایسی پارٹی میں کارخانہ دار، جاگیردار، سردار، پیر اور ملّا ہوتے ہیں۔ یہ اوپری استحصالی طبقہ کی پارٹی ہوتی ہے۔

کسی بھی ملک میں بورژوا پارٹیوں کے زیادہ ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سرمایہ دار طبقے کے اندر مختلف گروپ وجود رکھتے ہیں اور حکومتی اقتدار پر براجمان ہونے کے لیے ان کی آپس میں کشمکش ہوتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ بورژوازی، ایک سے زیادہ پارٹیاں بنا کر مختلف چہروں اور نقابوں کو عوام کو دھوکا دینے کے لیے بھی استعمال کرتی ہے تاکہ انھیں صاف اور کھلی طبقاتی جدوجہد سے باز رکھے۔ فاشسٹ پارٹیاں تو سرمایہ داری کو ضرب لگانے والے گروپ ہیں۔

اسی طرح بورژوازی، مزدور اشرافیہ سے کام لیتے ہوئے مزدوروں کو دھوکا دینے کے لیے مزدوروں کے اندر بھی اصلاح پسند تنظیمیں بنانے کی بھی کوشش کرتی ہے۔

2۔ پرولتاریہ کی سیاسی پارٹی

مزدور طبقے کی سیاسی پارٹی محنت کشوں کے مفادات کی ترجمانی اور ان کے مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ مزدوروں کی سیاسی پارٹی ہی محنت کشوں کی جدوجہد کی تینوں صورتوں (معاشی سٹرگل، نظریاتی سٹرگل، اور سیاسی سٹرگل) کو بہت ہنرکاری سے استعمال کرتی ہے۔

یہ پارٹی مزدوروں کے مفادات کے پیچھے پیچھے نہیں چلتی بل کہ اس کے برعکس وہ ''پرولتاری طبقے کا ہراول اور راہ نما ہوتی ہے۔''

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ساری ورکنگ کلاس، پارٹی سے تعلق نہیں رکھتی اور نہ اسے رکھنا چاہیے۔

پرولتاری پارٹی کے ممبر بننے کی شرائط:

ہر وہ شخص پارٹی ممبر بن سکتا ہے جو:

1۔ پارٹی کے پروگرام کو تسلیم کرتا ہو۔

2۔ پارٹی کو مالی طور پر مدد دیتا ہو۔

3۔ پارٹی تنظیموں میں سے ایک میں ذاتی طور پر حصہ لیتا ہو۔

پرولتاری پارٹی اپنی سرگرمیوں میں مارکسی لیننی علم، سماجی انقلابات اور نئے معاشرے کی بنیاد کے علم کو اپنا رہ نما بناتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ خود کے تجربے بھی اس کو مالا مال بناتے ہیں۔ ایسی پارٹی انقلابی علمی تھیوری اور مضبوط تنظیمی اصولوں کے علم سے مسلح ہوتی ہے۔

مارکسی پارٹی مزدور طبقے کا متشکل دستہ بھی ہے۔ ایسا دستہ جو مارکسزم اور لینن ازم کے انقلابی افکار کی سچائی کی مشترک تلاش اس طبقے کے افراد کے ساتھ مل کر کرتی ہے۔ یہ مزدوروں میں سوشلسٹ علم کی مسلسل نشوونما اور پرورش کرنے کے لیے کام کرتی ہے۔ یہ مزدور طبقے کو بورژوازی کے فاسد نظریے کے اثر سے بچاتی ہے۔

مارکسی اور عوام کی حقیقی پارٹی محنت کش عوام کے وسیع حصوں کے ساتھ ہزاروں طریقوں کے ساتھ ربط رکھتی ہے۔ چوں کہ پارٹی عوام کے مطالبات اور رجحانات کی مظہر اور ان کے بنیادی مفادات کے لیے مسلسل جدوجہد کرتی ہے اسی لیے اس کو عوام کی حمایت اور عوام کی امداد حاصل ہوتی ہے۔

یہ پارٹی ڈیموکریٹک سنٹرل ازم پر مبنی ہے۔ اس اصول پر سختی سے عمل کمیونسٹ پارٹیوں کی سرگرمیوں کا قابلِ دید قانون ہے۔ یہ اصول پارٹی کے دفاع، مزدور نظریہ کی مضبوطی، پارٹی ڈیموکریسی اور اجتماعی قیادت کے اصول پر عمل کو یقینی بنائے رکھتی ہے۔ اس اصول پہ کاربند رہنے سے پارٹی کی قیادت کے ساتھ ارکان اور محنت کشوں کے ساتھ پارٹی کے رابطے کو یقینی بنانے اور قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔ اسی اصول سے شخصیت پرستی جیسے زہر سے بچنے کو یقینی بنایا جاتا ہے اور اسی ڈیموکریٹک سنٹرل ازم کے اصول سے پارٹی کی صفوں میں تنقید اور خودتنقیدی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

ایسی پارٹیاں شخصیت پرستی کی سخت مخالف ہوتی ہیں۔ لیڈر کی پرستش یا پرسنیلٹی کلٹ تباہ کن ہوتی ہے۔ پرسنیلٹی کلٹ پارٹی کے رول کو کم کرتی ہے۔ یہ بیماری پارٹی اور محنت کش عوام کی تخلیقی سرگرمی کو گھٹاتی ہے۔ یہ اجتماعی لیڈرشپ کے ساتھ عدم مطابقت رکھتی ہے جو پارٹی لیڈرشپ کا بلندترین اصول ہے۔ لیڈر کی ممتاز اور نمایاں رول کو تسلیم کرنا تو اہم ہے۔ جو کہ وہ عوام الناس کی

تحریک کو منظّم کرنے اور راہ نمائی کرنے کی ایک عظیم اہلیت ہے مگر لیڈر کو کوئی مخلوق الفطرت دیوتا بنا کر اُس کی عبادت کرنا کبیرہ خباثت ہے۔ لیڈر کو پارٹی سے بلند نہ سمجھا جائے۔ پرسنیلٹی کلٹ تاریخی واقعات برپا ہونے کو ممتاز شخصیت سے منسوب کرتا ہے۔ یہ حرکت مارکسزم سے دشمنی ہے۔

انقلابی پارٹی کا حتمی ہدف سوشلسٹ انقلاب ہوتا ہے۔ یعنی مزدور طبقے کی پارٹی اپنے اتحادیوں (کسانوں، محکوم قوموں) کے ساتھ مل کر کیپٹلزم کا خاتمہ کر کے اقتدار سنبھالنا۔ اہداف میں طبقاتی استحصال کو بند کرنا، قومی حقِ خود اختیاری بشمول حق علیحدگی دینا، عورتوں کو مساوی حقوق و مواقع دینا اور رجعت پسندی کے خلاف مسلسل و پیہم جدوجہد شامل ہیں۔

صرف اور صرف تاریخی جدلیاتی سوچ کا مسلسل استعمال اِس پارٹی کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔

یہ دائیں یا بائیں مہم پرستی کے خلاف تین کام کرتی ہے۔

1۔ ماکسزم لینن ازم کا اپنے سارے اہداف اور جدوجہد پہ اطلاق کرتی ہے۔

2۔ پہنچے ہوئے فیصلوں کو عملی کرنے کے لیے ڈیموکریٹک سنٹرلزم کے اصول پہ چلتی ہے۔

3۔ لیفٹ سیکٹرین ازم اور رائیٹ موقع پرستی کے خلاف ایک نظریاتی جدوجہد چلائے رکھتی ہے۔

یہ پارٹی ورکنگ کلاس کا نہ صرف حصہ ہے بل کہ یہ اُس کا باشعور اور منظّم ہراول ہے۔ یہ پارٹی کلاس آرگنائزیشن کی بلند ترین شکل ہوتی ہے۔

البتہ یہ ورکنگ کلاس پارٹی ہر ملک میں ایک ہی طرح سے کام نہیں کرتی۔ آمریت، مارشل لا، بادشاہت اور کٹھ ملائیت والے سماج میں یہ پارٹی انڈر گراؤنڈ رہ کر سیاست کرتی ہے۔ بورژوا جمہوریتوں میں یہ اوپن سرگرمیاں کرتی ہے۔

لیکن وہ خواہ جو بھی طریقے استعمال کرے، لازم ہے کہ وہ طریقے مارکسزم کے عمومی مزاج اور تعلیمات کے مطابق ہوں۔ اِس پارٹی کے پاس اس کی اپنی ایک اخلاقیات، نظریات کا اپنا ایک پیکیج، اپنے طرز کی ایک آرگنائزیشن اور تنقید و خود تنقیدی کے اصول ہوتے ہیں۔

پارٹی پرولتاریہ کی تمام دوسری تنظیموں کی رہ بری کرتی ہے۔ ایک آہنی ڈسپلن والی پارٹی، ایک فقید المثال اتحاد والی پارٹی، سائنسی نظریات سے لیس پارٹی اور عوام کے ساتھ صمد بانڈ والا رشتہ

رکھنے والی پارٹی۔

یہ انقلابی پارٹی ترکیب اور بناوٹ کے اعتبار سے دو حصوں پہ مشتمل ہوتی ہے:

1۔ ایک تو شعور اور ڈسپلن میں آگے بڑھے ہوئے پارٹی کارکنوں کا محدود اور باقاعدہ گروہ ہوتا ہے جو ''انقلاب پیشہ'' لوگ ہوں۔ یعنی وہ لوگ جن کا بغیر پارٹی کام کے اور کوئی پیشہ نہ ہو، اور جن کے اندر کافی نظریاتی علم، سیاسی تجربہ اور تنظیم کاری کی صلاحیت موجود ہو۔ اس گروہ میں وہی لوگ ہوتے ہیں جو انقلابی کام کو اپنا مستقل پیشہ بنا چکے ہوں۔ ایک مطلق العنان حکومت کے اندر پارٹی کے ارکان کی تعداد کو جتنا زیادہ صرف ان ہی لوگوں تک محدود رکھا جائے، اتنا اچھا ہے۔ اس لیے کہ ''انقلاب پیشہ'' لوگوں کے اس ادارہ کو توڑنا مشکل ہوگا۔ ایسے ارکان کو عرفِ عام میں ''ہول ٹائمرز'' کہتے ہیں۔

پیشہ ور انقلابی کو عوام کی انتہائی گہرائیوں تک جانا ہوتا ہے، اُسے عوام کی ضرورتوں اور مزاج کی سمجھ حاصل کرنا ہوتی ہے۔ پروفیشنل انقلابی ہر طرح کے جبر و تشدد اور ظلم کے مظہر پر آواز بلند کرتا ہے۔ اس کے پاس ہر چھوٹی سے چھوٹی بات کو اس طرح استعمال کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے سوشلسٹ نظریے اور جمہوری مطالبات کو سب کے سامنے لاسکتا ہے۔ وہ سب سے اور ہر ایک سے پرولتاریہ کی جدوجہدِ آزادی کی عالمی تاریخی اہمیت کی وضاحت کرسکتا ہے۔

پارٹی ممبر انقلابی ڈپریشن کے زمانے میں پارٹی وقار اور پارٹی عزت کو بچانے کے لیے ہمہ وقت تیار ہوتا ہے اور جب ضرورت پڑے تو قومی سطح کے ایک مسلح ابھار تک کے لیے تیار رہنے، اُس کا منصوبہ بنانے اور عملی بنانے کا اہل ہوتا ہے۔

اِن ہول ٹائمرز کے پاس ضروری نظریاتی تعلیم، سیاسی تجربہ، اور تنظیمی مہارت ہوتی ہے۔ ہول ٹائمرز گویا پارٹی کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔

2۔ پارٹی کا دوسرا حصہ پارٹی کے مقامی اداروں کا پھیلا ہوا جال ہوتا ہے اور پارٹی کے عام ممبروں کی ایک بہت بڑی تعداد پہ مشتمل ہوتا ہے جن کو لاکھوں مزدوروں کی ہم دردی اور مدد حاصل ہوتی ہے۔

پارٹی کی لوکل اور ضلع کمیٹیاں ہوتی ہیں۔اسی طرح صوبائی اور سنٹرل کمیٹی ہوتی ہے۔

انقلابی پارٹی ہر پانچ برس بعد اپنی کانگریس منعقد کرتی ہے۔ دراصل پارٹی کانگریس ہی ورکنگ کلاس پارٹی کا سب سے اعلیٰ اور اتھارٹی والا ادارہ ہوتی ہے۔

کانگریس میں دو کام ہوتے ہیں:

i۔اگلے پانچ سال کے لیے پارٹی پالیسیاں، سیاست اور تنظیم کاری متعین ہوتی ہے۔

پہلا قدم تو یہ ہوتا ہے کہ کانگریس سے کئی ماہ پہلے سنٹرل کمیٹی کی طرف سے تیار کردہ قرار دادیں اور سیکرٹری جنرل رپورٹ غیر حتمی مسودے کی شکل میں پارٹی شاخوں کو بھیجی جاتی ہیں۔اس طرح اِن مسودات پر کانگریس کے انعقاد سے کئی ماہ قبل پارٹی کے اداروں اور علاقوں میں ایک زبردست بحث مباحثہ چلتا ہے۔اس بحث میں پارٹی کے سارے ممبر، کمیٹیاں اور پارٹی کی ماس تنظیمیں حصہ لیتی ہیں۔ وہ پارٹی پالیسی، نظریہ، سیاست اور تنظیم کے مسودے میں تبدیلیاں اور اضافے تجویز کرتی ہیں۔

اختلافی معاملات پر پارٹی کے اندر ووٹنگ ہوتی ہے۔ اس ووٹنگ میں جس گروہ کو شکست ہوتی ہے، اسی میں سے ایک کو اب متفقہ اور حتمی منظور کردہ قرارداد لکھنے کو دی جاتی ہے۔

''مرکزی قرارداد کمیٹی'' موصول شدہ ان تجاویز کو اس طرح منظّم کرتی ہے کہ جب کانگریس منعقد ہو تو وہاں بحث کو مزید مرکوز کیا جا سکے۔ چوں کہ اس قدر مفصل بحث کو صرف دو تین روزہ کانگریس میں سمیٹنا ممکن نہیں ہوتا، اس لیے اِس پراسیس کے ذریعے کانگریس میں پہلے ہی زیادہ سے زیادہ اتفاقِ رائے پیدا جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ اس پراسیس سے گزرنے کے بعد اِن مسودات کو مزید اتفاقِ رائے پیدا کرنے اور حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے کانگریس کے تین چار دن کافی ہوتے ہیں۔

ii۔کانگریس پختہ کار اور مستحکم انقلابیوں پہ مشتمل ایک سنٹرل کمیٹی منتخب کرتی ہے۔ پانچ سال بعد اگلی کانگریس کے انعقاد تک یہ سنٹرل کمیٹی پارٹی چلاتی ہے۔

کانگریس میں پارٹی اخبار کے لیے ایڈیٹوریل بورڈ منتخب کیا جاتا ہے۔ جو عموماً تین ممبرز

پر مشتمل ہوتا ہے۔

پارٹی کے یہ تمام ادارے منتخب ہوتے ہیں۔

پارٹی کے تمام ادارے مرکز کے تابع ہوتے ہیں۔ نچلے ادارے اوپری اداروں کے اور اقلیت اکثریت کی تابع ہوتی ہے۔ پارٹی کے اندر شعوری اور مضبوط ڈسپلن ہوتا ہے جو پارٹی کے سب ارکان کے لیے یعنی اوپر سے نیچے سب کے لیے بغیر کسی استثنا کے ایک ہی طرح کا ہے۔ ڈیموکریسی اور سنٹرل ازم پارٹی کی داخلی زندگی میں ایک واحد اصول کے دو پہلو بنتے ہیں اور اس پر مکمل طور پر عمل کیا جانا پارٹی کی داخلی زندگی کے لیے ضروری شرط سمجھی جاتی ہے۔

پارٹی ڈیموکریسی کے معنی یہ ہیں کہ:

1۔ پارٹی کی رہ نمائی کرنے والے تمام ادارے اوپر سے نیچے تک منتخب ہوتے ہیں۔

2۔ پارٹی میٹنگوں میں پارٹی کے قوائد کے مطابق سیاسی اور تنظیمی مسائل کے اٹھانے اور ان پر بحث کرنے کا حق پارٹی کے تمام ارکان رکھتے ہیں اور یہ حق ختم نہیں کیا جا سکتا۔

پارٹی اخبار

تاریخ میں جہاں جہاں انقلابی پارٹی بنی وہ اپنے اخبار ہی کے ذریعے بنی۔ پارٹی اخبار مندرجہ ذیل کام کرتا رہا ہے:

* یہ عوام اور پارٹی کے درمیان، پارٹی کارکنوں کے اپنے درمیان اور پارٹی کارکنوں اور لیڈرشپ کے درمیان رابطے کا ہتھیار ہے۔
* نظریاتی ستھرائی کو بڑھاوا دینے کا زبردست کام۔
* یہ روزمرہ سیاست میں بہتر سائنسی مؤقف اپنانے میں راہ نمایانہ رول ادا کرتا ہے۔
* یہ پارٹی ورکرز کے لیے تازہ آکسیجن کا کام دیتا ہے۔
* اس سے پارٹی اتحاد، ڈسپلن اور تنظیم کو زبردست تقویت ملتی ہے۔
* اخبار پارٹی پروپیگنڈہ کا ایک مسلسل ہتھیار ہے۔

* ایجی ٹیشن کے زمانوں میں پارٹی اخبار، بالخصوص روزنامہ اخبار بہت مؤثر ہوتا ہے۔
* کبھی کبھی تو مختلف جگہوں پر پارٹی اخبار کے نمائندوں ہی پر پارٹی استوار کی گئی۔

چناں چہ ہر ممبر کے لیے پارٹی اخبار کا نہ صرف انفرادی طور پر پڑھنا ضروری ڈیوٹی ہوتا ہے بل کہ اسے پارٹی کمیٹیوں اور یونٹوں میں پڑھنا اور اس پہ بحث کروانا بھی لازمی ہوتا ہے۔
المختصر، پارٹی اخبار پارٹی کی لائف لائن ہوتا ہے۔

پارٹی کے خلاف سازشیں

طبقاتی کشمکش سماج میں ارتقا اور انقلاب کا بنیادی سبب ہوتی ہے مگر یہ طبقاتی کشمکش اکیلی انقلاب نہیں لاسکتی۔ سماجی تبدیلی یا انقلاب ایسے ہی ''سَٹھی'' میں نہیں آتے۔ موزوں حالات کا ایک مجموعہ آجاتا ہے جب تبدیلی کے امکانات روشن ہوجاتے ہیں۔ اُن میں سے ایک تو یہ ہے کہ محنت کرنے والا طبقہ نظام میں نشوونما پاتے پاتے ایک خاص مرحلے میں مالک طبقات کے قائم کیے ہوئے سارے نظام کے ساتھ متصادم ہونے لگتا ہے اور یہ سارا نظام اِن محنت کرنے والوں کی ترقی میں رکاوٹ بن جاتا ہے تب اُس سارے نظام کو ڈھا دینے کے علاوہ کوئی اور راہ نہیں رہ جاتی۔ کیوں کہ محنت کرنے والے بہت ترقی کرجاتے ہیں اور نظام اُن کے لیے وہیں کا وہیں رہتا ہے۔ جب دونوں میں مطابقت نہیں رہتی تو ارتقا رک جاتا ہے اور ارتقا کے بغیر تو زندگی ختم ہوتی ہے چناں چہ محنت کرنے والوں اور نظام میں، مطابقت پیدا کرنے کے لیے سماجی انقلاب کا برپا ہونا لازمی بن جاتا ہے۔ تب یہ نظام ٹوٹ جاتا ہے اور محنت کرنے والوں کے ارتقا کی سطح کی مطابقت میں اور ارتقا پذیری کو مہمیز دینے والا نظام قائم ہوجاتا ہے۔ دونوں کی مطابقت میں پیداواری قوتوں کی نشوونما ہونے لگتی ہے۔ تب سماجی تبدیلی کا دور شروع ہوتا ہے۔

حکم ران طبقات نہ صرف اپنی ملکیت اور ملکیتی اقتدار کے لیے لڑتے ہیں بل کہ اپنی اس طبقاتی لڑائی میں ریاست کو بھی گھسیٹ لاتے ہیں۔ یعنی عدلیہ، میڈیا، فوج، اسمبلی، پنڈت، پیر اور

بورژوا دانش ور سب اس لڑائی میں اعلانیہ شامل ہوجاتے ہیں۔ یوں خود ریاست طبقاتی جدوجہد میں ایک ہتھیار کے بہ طور بے نقاب ہوکر سامنے آجاتی ہے۔ اب بورژوا حکم رانی کی برقراری کے لیے ریاست ایک اہم ہتھیار بن جاتی ہے۔ یعنی لُٹ جانے والا طبقہ اپنے شعور، آرگنائزیشن اور کثیر تعداد کے بل بوتے پر بالادست طبقہ کو اقتدار سے بے دخل کرنا چاہتا ہے اور حکم ران طبقہ اپنی پوری ریاستی مشینری کی مدد سے اُن کی ''بغاوت'' کو کچل ڈالنے کی لڑائی لڑتا ہے۔

یہ تو معلوم بات ہے کہ کسی بھی جدوجہد، بغاوت، الیکشن یا انقلاب کا بنیادی سوال ریاستی اقتدار پر قبضے کا سوال ہے۔ باقی تو بس زیبِ داستان ہے۔ کسی بھی انقلاب کی روح اقتدار کا حصول ہے۔ صرف بنیادی انقلابی تبدیلیوں کے ذریعے ہی پرانے رجعت پرستانہ سماجی نظام کو ختم کیا جاسکتا ہے اور ایک نئے پروگریسو سماجی نظام کو نافذ کیا جاسکتا ہے اور وہ معاشی اور طبقاتی تضادات جو پرانے سماج کی ترقی کے طویل دور میں پختہ اور گہرے ہوتے ہیں، انھیں سماجی انقلاب کے بغیر حل نہیں کیا جاسکتا۔

سماجی انقلاب سماجی زندگی میں زبردست اہمیت رکھتے ہیں۔ سماجی انقلاب کے دوران عوام کی تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں اور وہ تبدیلیوں میں باشعور اور بامقصد حصہ لیتے ہیں۔ سماج کی تبدیلی کا عمل سماجی انقلاب کے باعث تیز ہوجاتا ہے۔

ماضی میں بھی اور مستقبل میں بھی کافی عرصے تک انقلاب ایک بدبخت خون ریزی (انقلاب سے پہلے، انقلاب کے دوران یا بعد از انقلاب) کے بغیر ممکن نہیں۔ لکھ کر لیجیے کہ انقلاب پوسٹ آفس میں خط ڈالنے کا نام نہیں ہے کہ وہ خود بہ خود آگے ڈلیور ہوجائے گا۔ نہ انقلاب کسی لیڈر کی مرضی کا محتاج ہے کہ حکم دیا 'ہوجا انقلاب' اور 'ہوگیا انقلاب'۔ انقلاب ہوتا نہیں، لایا جاتا ہے۔

انقلاب اپنے آپریٹروں کی آنتیں جلاتا ہے۔ آنا نہ آنا تو الگ بات اور اگر کہیں انقلاب آجائے تو اُس عہد کے لوگوں کے لیے اپنے پیش رو جُہد کاروں کو فراموش کرنا ناممکن ہوتا ہے۔

طبقاتی کشمکش کی انقلاب میں صفتی تبدیلی کے لیے کچھ شرائط کا پورا ہونا لازمی ہے۔ استثنائیں اپنی جگہ مگر قانون یہ ہے کہ کچھ لوازمات کی تکمیل کے بغیر تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔ انھیں

''انقلابی صورت حال'' بھی کہا جاتا ہے اور یہ ''انقلابی صورت حال'' چار شرائط کے پورا ہونے سے مشروط ہے:

1۔ نچلی کلاسز پرانے طرز سے مکمل بے زار ہو جاتی ہوں۔

2۔ بالائی حکم ران کلاسز پرانے نظام کو برقرار نہ رکھ سکتی ہوں۔

3۔ ورکنگ کلاس کی سیاسی پارٹی اقتدار لینے کے لیے تیار اور پرجوش ہو۔ یعنی ورکنگ کلاس حکم ران کلاس سے لڑنے کے لیے تیار ہو۔

سماجی انقلاب کے لیے کلاس فورسز کا توازن دیکھنے کے علاوہ ایک ضروری چیز ورکنگ کلاس صفوں کی مضبوط حالت ہے۔ ضروری ہے کہ ورکنگ کلاس کے پاس انقلاب کی قیادت کے لیے ایک اہل، تجربہ کار اور منجھی ہوئی منظّم سیاسی پارٹی ہو۔ ورکنگ کلاس بہ طور ایک کلاس کپٹلزم کے بارے میں سارے واہموں کو جھٹک چکی ہو، ریفارمزم کے نظریے اور پالیسیوں کو مسترد کرتی ہو۔ بڑے پیمانے پر انقلابی کارروائی کے لیے تیار کھڑی ہو۔ یعنی وہ کلاس سیاسی طور پر باشعور سیاسی پارٹی میں منظّم ہو، معاشی طور پر مفلوج اور اپنی حالت بدلنے کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہو۔ نیز اُس نے ایسی ہی حالت میں موجود دوسرے لوگوں یعنی، کسانوں، عورتوں، مظلوم قومیتوں اور روشن فکر دانش وروں سے پکا اتحاد کر لیا ہو۔

اِس سارے پیراگراف کو ''موضوعی صورت حال'' کہتے ہیں۔

ویسی موضوعی صورت حال موجود نہ ہو تو انقلابی صورت حال بھی موجود نہیں ہوتی۔ انقلابی سیاسی پارٹی کی مضبوطی انقلاب کی ایک لازمی شرط ہے۔

4۔ اوپر بیان کردہ تینوں شرائط سماج کے ''اندرونی'' لوازمات تھے جو ایک سماجی انقلاب کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ ایک ڈھائی ویں شرط بھی بہت اہم ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ہے ''بیرونی صورت حال کا موافق ہونا''۔ اب تو سوشلسٹ کیمپ کی 1990ء کی دہائی میں تباہی کے بعد بالخصوص کپٹلسٹ دنیا اس قدر مضبوط و منظّم و جنگ جو ہو چکی ہے کہ اس بیرونی صورت حال کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔

یہ طریقہ ہر معاشرے کو خود ڈھونڈنا ہوگا۔ اب بیسویں نہیں، اکیسویں صدی ہے۔ بیسویں صدی میں سوشلسٹ انقلابات لائے گئے تھے اور غیر معمولی مشکل صورت حال میں سوشلزم کی تعمیر کی کوششیں ہوئی تھیں۔ وہاں زبردست حاصلات ہوئی تھیں، غلطیاں، کوتاہیاں بھی بڑی بڑی ہوئی تھیں اور بالآخر شکستیں بھی۔ یہ سب اکیسویں صدی کے انسان کے لیے تجربات ہیں، سبق ہیں۔ بیسویں صدی میں سام راج کی گرفت اس قدر مضبوط نہ تھی، جتنی اب ہے۔ وہاں سام راج کو وہ سائنس اور ٹکنالوجی دست یاب نہ تھی جو آج کے سام راج کو ہے اور اُس وقت ایک سوویت یونین موجود تھا، جو اب نہیں ہے۔

اب کسی بھی ملک کے سماجی انقلاب اور اس کی کام یابی کے لیے بہت ضروری ہو گیا ہے کہ کپٹلسٹ کیمپ کا اتحاد ڈھیلا پڑ جائے، وہ انتشار کی کیفیت میں مبتلا ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ عالمی مزدور تحریک آپ کے انقلاب کا ساتھ دے۔

اسی طرح ہم نے دیکھا کہ غلام داری سماج کا لباس، نظریہ اور قوانین اگلے سماج کے آتے ہی رفو چکر ہو گئے۔ اس کا یہ مطلب بھی نکلا کہ قوانین، نظریات اور عقیدے حتمی اور ابدی نہیں ہوتے بل کہ ہر موڈ آف پروڈکشن پچھلوں کی بیٹری ڈبو کر اپنے نئے نظریات ساتھ لاتا ہے۔ اس لیے جو لوگ فیوڈلزم کے دور کی غیرت، لباس اور طور طریقے کپٹلزم میں ڈھونڈتے ہیں، وہ گم راہ ہو جاتے ہیں۔ انسانی حقوق کا چارٹر، عورتوں کا بیجنگ اعلان نامہ اور یونائٹڈ نیشنز کے ریزولیوشنز غلام داری سماج میں تو نہیں لکھے جا سکتے تھے ناں!

سماج کے طبقاتی ڈھانچے میں ریڈیکل تبدیلی اپنی مطابقت میں کلاس سٹرگل کی شکلوں میں تبدیلی کو متعین کرتی ہے۔ کپٹلزم سے سوشلزم کی طرف عبور کے پیریڈ میں کلاس سٹرگل رک نہیں جاتی بل کہ اس کے معین کردہ کام، شکلیں اور ذرائع آبجیکٹو صورت حال کے مطابق لازمی تبدیلی سے گزرتے ہیں۔ یہ بنیادی طور پر اس حقیقت کے سبب ہے کہ ''اب'' ریاست جیسے طاقت ور ہتھیار کے مالک کے بہ طور ورکنگ کلاس بہ طور حکم ران طبقہ سٹرگل کرتا ہے۔ اب سٹرگل کے متعین کردہ کام بھی مختلف ہوتے ہیں۔ دو اہم یہ ہیں: پہلا استحصال کرنے والوں کے خلاف لڑنا، اُن کی مزاحمت کو

دبانا اور آخر میں انھیں ختم کرنا۔ دوسرا، نئے سوشلسٹ نظام کو تُندی اور تن دہی کے ساتھ عوام میں لے جانا۔

ہاں البتہ اس غلط فہمی میں نہ رہیے کہ چوں کہ آج کے ترقی یافتہ کپٹلزم میں سوشلزم ایک معروضی لازمیت ہے اس لیے یہ خود بہ خود، آٹو میٹک طور پر ہو کر رہے گا۔ نہیں۔ ورکنگ کلاس آبجیکٹو اور سبجیکٹو حالات کو مناسب دیکھ کر (اور بنا کر) شعوری سرگرمی کرے گی تو تبدیلی آئے گی۔

ہمارے ہاں دنیا میں جدید طرز کی سیاسی پارٹی (کمیونسٹ پارٹی) کو سماجی تبدیلی کی جدوجہد کرتے ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر رہا ہے مگر اس کے باوجود انقلاب ابھی تک ہاتھ نہ آیا۔

سماج پی ٹی کلاس نہیں ہوتا کہ سیٹی بجے تو اٹنیشن ہوجائے اور سیٹی بجے تو سٹینڈ ایٹ ایز ہوجائے۔ سماج کسی ماسٹر، ہیڈ ماسٹر کو نہیں مانتا۔ وہ اپنے سے باہر اور اپنے سے اوپر کی ہر چیز کے سامنے اندھا، بہرا اور بے حس ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنی ضرورتوں کو نقارے کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے وقت ہی حرکت کرتا ہے اور عام تصور کے برعکس، سماج کبھی کبھی حتیٰ کہ اپنی ضروری ترین ضرورت یعنی معاشیات کی بھی آٹو میٹک انداز میں تابع داری نہیں کرتا۔

تاریخ دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ انقلاب کے خلاف سکوت و جمود کی بادشاہی بہت دیر تک جاری رہی۔ جیسا کہ لینن نے کہا تھا کہ: ''دسیوں سال ایسے گزر جاتے ہیں کہ کچھ بھی وقوع پذیر نہیں ہوتا اور پھر چند ہفتوں کے اندر دسیوں سالوں والے واقعات ہوجاتے ہیں۔'' ہم نے اب تک یہی دیکھا اور ہمارے عوام وہ دن بھی دیکھیں گے جب ذرا سا غلاف ہٹے اور معاشرہ پھٹ پڑے۔ مطلب یہ کہ اضداد کا توازن کبھی مطلق نہیں ہوتا، اضداد کی کشمکش کبھی نہیں رکتی۔ کوئی منت سماجت، کوئی میٹرھ مرکہ اس تصادم و کشمکش میں مفاہمت پیدا نہیں کرسکتا۔ آقا اور غلام میں طاقت اور کم زوری تو ہوسکتی ہے مگر باہم امن نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح فیوڈل ازم میں کسان اور فیوڈل کے بیچ طاقت وری اور کم زوری تو ہوسکتی ہے مگر باہم امن نہیں ہوسکتا جب تک کہ فیوڈلزم ختم نہیں ہوتا۔ ملا، پادری اور پیر سب کی کرامتوں، تعویذوں، دعاؤں اور جادوگر کے رقص کرنے اور پارسا کے دم چُھو کے باوجود فیوڈلزم نے مر جانا ہوتا ہے۔ کپٹلزم میں بھی کپٹلسٹ اور مزدور کے بیچ وقتی طاقت

وری و کم زوری تو ہوسکتی ہے مگر باہم امن نہیں ہوسکتا، جب تک کہ کپٹلزم ختم نہ ہوجائے۔

دوسرے ممالک میں تبدیلیوں کی مثالیں دیتے وقت ایک بات یاد رکھنے کی ہے: کسی بھی دو ملکوں کی سیاستیں ہو بہ ہو ایک طرح نہیں ہوتیں۔ چناں چہ ممالک کے انقلابات ایک دوسرے سے ملتے جُلتے ہونے کے باوجود بہت مختلف ہوتے ہیں۔ ہر انقلاب کا اپنا مزاج ہوتا ہے، اپنی اپنی سست یا تیز رفتاریاں ہوتی ہیں۔ اُن کی جیومیٹریاں تک مختلف ہوتی ہیں۔ ہر انقلاب کے راستے اُس کے اپنے کھڈے اور رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ ہر سماج اپنے اپنے واقعات سے حاملہ ہوتا ہے۔ اس لیے کسی دوسرے انقلاب کی نقل کرنا تباہ کن ہوتا ہے۔

ہمارے جیسے ایک بنیاد پرست اور مارشل لا زدہ سماج میں پارلیمانی سیاست کرنا تک ایک پل صراطی کام ہے۔ بالخصوص، جب سیاست ہی کو جھوٹ، منافقت، ٹھگی، لفنگائی اور کاروبار مشہور کیا گیا ہو۔ ہمارے ہاں کی آج کی سیاست حتمی طور پر غیر سیاسی پن (جو خود ایک سیاست ہے) کے نرغے میں ہے۔ بہت استادی کے ساتھ سیاست کو شیطانی کام مشہور کر دیا گیا ہے۔ اسے سمگلروں کا کام، بھتہ خوروں اور بے ضمیروں کا کام قرار دیا گیا ہے۔ چناں چہ ادبی اور علمی میدان میں بھی ایسے فقرے ضرب الامثال کے بہ طور عام ملتے ہیں: ہمارے ساتھ سیاست نہیں کرو۔ فلاں معاملے کو سیاست سے بالاتر ہو کر دیکھنا چاہیے، فلاں کام سیاست کی نذر ہو گیا ہے۔

ایسے ماحول اور سماج میں ایک سیاسی ورکر کا ملنا ہی غنیمت ہوتا ہے۔

بورژوازی ایک اور کام بھی کرتی ہے:

عوامی سیاسی ورکر اور لیڈر کو خراب بتانا۔ سرکار و سردار اپنے اپنے رجمنٹوں کو سب کو ''گندا'' ثابت کرنے پر لگاتے ہیں۔ سب خراب ہیں، سب کرپٹ ہیں، سب ''اِس کے'' یا ''اُس کے'' غدار ہیں۔ کبھی کبھی کسی مرحوم شخصیت کی تعریفیں کر کر کے، اسے واحد نجات دہندہ قرار دے کر اُس کی آڑ میں باقیوں کو ایجنٹ ثابت کیا جاتا ہے۔ بس سب خراب ہیں۔ اُن کی طرف سے کسی بھی عوامی سیاسی ورکر یا رہنما کو غیر متنازع رہنے نہیں دیا جاتا۔ سب کو متنازع بنا دیا جاتا ہے۔ یہ آج کا نہیں، بہت پرانا دھندہ ہے۔ اب اکیسویں صدی میں تو صرف ''روس کی ایجنٹی'' کا لیبل ختم ہوا۔

باقی ساری تہمتیں، ساری سیاہ رنگیاں، ساری سیاہ بختیاں باقی ہیں۔ سرکار آپ کو متنازع بنا دیتی ہے، سردار متنازع بنا دیتا ہے۔ اِن کے دانش ور کارندے آپ کو متنازع بنا دیتے ہیں۔ رائٹ کا ادارہ بنے دانش ور ایسا کرتے ہیں، فریب دِہ انقلابی چوغوں میں ملبوس بہروپیے ایسا کرتے ہیں۔ کبھی ''خواہ مخواہ'' والے لوگ یہ ٹائم پاسی کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ جینوئن انقلابی لوگ تک ایک دوسرے کو متنازع بنا ڈالتے ہیں۔

اس سب کا اصل مقصد سیاست کو خراب بتانا ہے۔ اب چوں کہ سیاست ہی خراب ہے تو موروثی حاکمیت کا متبادل گویا پیدا ہی نہیں ہوگا۔ جان جائیے کہ خانِ کلات اور نواب خاران کی موروثی حاکمیت صرف اور صرف سیاست سے تبدیل کی جاسکتی ہے۔ یہ سیاست خواہ زمین دوز ہو، سطحِ زمین پہ ہو، پارلیمانی یا غیر پارلیمانی ہو، وفاقی ہو یا قومی اور صوبائی۔

بورژوا دانش وروں کے بہ قول سیاست تو خراب ہے، چناں چہ آج تیسری دنیا میں عوام کے پاس بادشاہ کا متبادل موجود نہیں ہے، جام کا متبادل، جرنیل کا متبادل، نواب کا متبادل اور پیر، ملّا کا متبادل موجود نہیں۔ متبادل سب کے سب متنازع۔ اس لیے اپنا پرانا بادشاہ اور وہی اپنا سردار ہی غنیمت ہے، اُسی پہ صبر شکر کرو۔

جو ''سٹیٹس کو'' متبادل قیادت اور سیاست کو متنازع نہ بنا پائے، وہ ناکام ''سٹیٹس کو'' ہوتا ہے۔ آج موجود سوشل میڈیا نے متنازع سازی کے اس کام کو بہت آسان کر دیا ہے۔ نیز انقلابی تحریک کی غیر منظمی نے بھی بورژوا دانش وروں کے اس کام کو بہت آسان بنا دیا ہے۔

گو کہ انقلابی دانش وروں کا حق ہے کہ وہ تجزیہ کر کے بتا دیں کہ فلاں پارٹی بورژوا ہے، اور فلاں انقلابی۔ یہ بھی کہ فلاں لیڈر بورژوا ہے یا انقلابی۔ مگر پرابلم پھر یہ بنتا ہے کہ آیا ہم ''متنازع'' والے مقصد کو ہٹا کر اس طرح کر سکتے ہیں۔ اپنے آزادانہ تجزیہ سے لفظ ''متنازع'' ہٹا پانے کی اہلیت رکھتے ہیں؟ کیا ہم Perception کے پردوں کو چیر کر سیاست کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ اور پھر حقیقت جان کر اسے عوام الناس میں مروج کر سکنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟!

کاش ایسا ہو۔

اب تو کلاس اینگل دیکھنا بالکل ترک کر دیا گیا ہے۔ حیرت ہے کہ یہ عینک نہ رہے تو تجزیہ کیسا؟ اور جو دانش ور تجزیہ نہ کر سکے تو یقین کیجیے کہ وہ سیاست کے رنگین میدان میں ہر رنگ کا مشیر بنا پھرتا ہوگا۔ تجزیہ نہ ہوگا تو تیسری رائے کیسے بنے گی؟ لوئر کلاس کی پارٹی کیسے بنے گی!

دنیا بھر میں ہمیشہ سے حکم ران کلاسز نے بہت احتیاط سے تبدیلی کا ہر دریچہ بند کر دیا ہوتا ہے۔ ہر طرح سے ورکنگ کلاس پارٹی کے بننے، منظّم ہونے اور عمل کرنے کی راہیں سیمنٹ کی جا چکی ہوتی ہیں۔ تیسری دنیا میں بہت بندوبست سے یہ کام کیا جا چکا ہے۔ اس معاملے میں بہت خون آشام تاریخ کے باوجود حالات مثبت کی طرف بڑھنے سے کٹھور پن کے ساتھ انکاری ہیں۔

لہٰذا مایوسی فطری ہے۔ چاروں طرف سے اور آٹھوں پہر ہم ہر دانش ور سے ایسی باتیں سنتے رہتے ہیں۔

مخالف طبقہ کی مضبوطی، چابک دستی اور ہوش مندی، خبرداری بھی اپنی جگہ مگر ہمارے مڈل کلاس دانش ور بھی چیزوں کا ادراک درست طریقے سے نہیں کر پا رہے ہیں۔ بلاشبہ بلوچستان جیسے بچھڑے اور پچھڑے سماج میں فرد کا رول بہت زیادہ ہوتا ہے۔ مگر لکھاریوں کی جانب سے شاید فرد کا یہ رول کچھ زیادہ ہی بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہوتا ہے۔ حالاں کہ تبدیلی اور انقلاب فرد نہیں، عوام لاتے ہیں۔ مگر وہ بھی 'بٹن آن بٹن آف' والی قدرت نہیں رکھتے۔ نہ وہ کسی کی فرمائش یا حکم سے ایسا کرتے ہیں۔

عوام کا مطلب ہی محنت کرنے والے عوام ہیں اور چوں کہ حالیہ تاریخ میں دنیا بھر کے اندر طبقاتی نظام چلتا آ رہا ہے اس لیے عوام کا مطلب استحصال شدہ محنت کنندہ عوام ہے۔ یہ تو واضح ہے کہ غاروں کے اولین آدمی سے لے کر اکیسویں صدی کی ترقی یافتہ دنیا تک پہنچنے کی ساری تاریخ محنت اور پیداوار کے دم قدم سے ہے۔ ساری فنی ترقی محنتی عوام کے دم سے ہے۔ ذرا غور کریں تو وہ صرف فنی ترقی کے بانی نہیں ہوتے بل کہ فنی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماجی تبدیلیوں کے بانی بھی عوام ہیں۔ غلامی کے خلاف ساری جدوجہدیں عوام نے کیں، فیوڈلزم کو عوام کے علاوہ کون توڑ سکتا تھا۔ اسی طرح عوامی ایجادات نے سائنسی دنیا کی تاریخ بنا دی۔ ایک عام ہل سے لے کر

ہیوی انڈسٹری تک اور فلسفہ کے الف بے سے لے کر اُس کے معراج یعنی مارکسزم تک سب کچھ محنت کرنے والے عوام اور اُس کے طرف ار دانش ر نے مرتب کیا ہے۔ حقوق کے لیے انفرادی لڑائی سے لے کر طبقاتی جدوجہد تک آپ کو عوام ہی نظر آئیں گے۔

اسی تاریخ سازی میں وہ ایسے افراد بھی پیدا کرتے ہیں جو کسی فیلڈ میں راہ نمائی کا رول ادا کر سکتے ہیں۔ یہ جو ہمیں ''عظیم'' افراد نظر آتے ہیں، یہ آسمان سے نہیں آتے، نہ وہ اتفاقاً پیدا ہوتے ہیں۔ تین باتیں اہم ہیں: عوام، تاریخی ضرورت اور لیڈر۔ ایک دوسرے سے سختی سے جڑی یہ تکون کبھی الگ نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے جان بوجھ کر لیڈر آخر میں لکھا ہے۔ اِس لیے کہ عوام اور تاریخی ضرورت موجود ہو تو لیڈر نے ضرور پیدا ہونا ہوتا ہے۔ یہ لیڈر نہیں تو وہ لیڈر، فلاں نہیں تو فلاں۔ وہ لیڈر خواہ زبردست ہو یا کم صلاحیت والا لیکن اُس نے پیدا ہونا ہی ہے۔ اس لیے کہ عوام اور تاریخی ضرورت اپنی سہولت کے لیے ایسا کرواتے ہیں۔ اس لیے کسی طرح کی ہیرو پرستی اور شخصیت پرستی میں گرفتار نہیں ہونا چاہیے۔

سماج کے قوانین ہمارے یا ہمارے لیڈر کے مزاجوں کے اتار چڑھاؤ کے محتاج نہیں ہوتے۔ ضروری ہے کہ جدید اور سائنسی اصولوں کے ساتھ ساری ممکنات کو برانگیخت کرنے کا کام جاری رکھا جائے۔ عوام الناس کے ساتھ رہتے ہوئے اُنھیں جامع طور پر تیار کرنے اور انھیں سارے اوزاروں سے لیس کرنے کا کام جاری رکھا جائے۔

چوں کہ ایک عرصے سے اس خطے کا دانش ور لفظ ''حکم ران طبقات'' کا استعمال ترک کر چکا ہے۔ اسی وجہ سے وہ ہر بار کسی نئے گھڑے ہوئے بُت کو نجات دہندہ قرار دے کر اُس کے قصیدے پڑھنے لگ جاتا ہے۔ ''حکم ران طبقات'' اتنا اہم لفظ ہے کہ دنیا بھر میں جس سیاسی ورکر اور دانش ور نے اُسے ترک کیا، بھٹکتے رہنا اُس کا مقدر بنا۔ یہی کچھ ہمارے خطے میں ہوا۔ ہم یہاں اس اصطلاح کو بالکل ہی فراموش کر بیٹھے ہیں۔ اسی وجہ سے تو ہم دو آپشنوں پہ لٹکے چلے آ رہے ہیں: مارشل لا یا ''بورژوا جمہوریت''۔

ظاہر ہے کہ ہر باشعور اور آزاد فکر انسان مارشل لا سے دور بھاگے گا اور جمہوریت کے حق

میں جائے گا۔ اس لیے کہ یہاں مارشل لاؤں نے فیوڈلزم کو اپنا کر ہمارے معاشرے کے تار و پود اکھیڑ رکھے ہیں۔

مگر اس معاملے میں مارشل لا والے کبھی اکیلے نہ تھے۔ عدالت ان کے ساتھ تھی۔ ملٹری اور سول بیوروکریسی شامل تھی۔ میڈیا اُن کے ساتھ تھا۔ جاگیردار، پیر اور پنڈت ان کے ساتھ تھے، بورژوازی ان ہی کے ساتھ تھی اور نام نہاد ''مڈل کلاس'' اُن کی اتحادی تھی۔ پیٹی بورژوا دانش ور، شاعر اور ادیب ان ہی کے حاشیہ بردار تھے۔ ان ہی نو (9) قوتوں کو ملا کر جو گروہ بنتا ہے اُس کو ''حکم ران طبقات'' کہا جاتا ہے۔ یہ 9 قوتیں ایک دوسرے سے کبھی بھی جدا نہیں ہوتیں۔ حکومت خواہ، خامنائی کی ہو، ضیاء الحق کی ہو، یا حامد کرزئی کی۔

اصلی لفظ ''حکم ران طبقات'' چوں کہ چھوٹ گیا، اس لیے لوگوں نے بس ایک فقرے کو پلّو سے باندھا: ''بدترین جمہوریت بھی بہترین مارشل لا سے بہتر ہے۔''

یہاں ''حکم ران طبقات'' ہی کی نگرانی میں سیاسی پارٹیاں بنوائی گئیں، لیڈر تراشے گئے اور نعرے ڈھالے گئے۔ رومان بھرے اور تفکر و صبر سے عاری دانش وروں نے بھی جمپ مارا اور بجائے اپنی پارٹی بنانے کے، لیڈروں کے پیچھے چلنے لگے۔ موقع پرست دانش ور اِن نئی نئی بورژوا سیاسی پارٹیوں کے منشور، تقریریں اور قراردادیں لکھنے لگے۔ اُن کے لیے ترانے گھڑ لیے اور لیڈر صاحب کو پاک پوتر، اصولی اور انقلابی بنا کر پیش کیا۔

حکم ران طبقات نے مینی پولیٹڈ فیوڈل نفسیات کے عین مطابق پارٹی کے بجائے اُس کے لیڈر کو بہت معتبر بنا دیا۔ یوں لیڈر، پارٹی اداروں اور اُس کے اساسی اصولوں سے بالاتر ہو گیا۔ پارٹی، سیاسی پارٹی کے بجائے جاگیردار کا ڈیرہ بن گئی۔ لیڈر ہی کا فقرہ آئین اور اسی کی بات حتمی ٹھہری۔ اُسی سے وفاداری پارٹی سے وفاداری قرار پائی اور اسی کی خوشنودی عزت و ترقی کا معیار ٹھہری۔

انٹیلی جنشیا ذہنی کام کرنے والوں یعنی انجینئروں، ڈاکٹروں، ٹیچروں، ادیبوں اور فن کاروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ لوگ ایک الگ مگر غیر بنیادی تیسرا طبقہ تشکیل دیتے ہیں۔ یعنی بورژوازی اور پرولتاریہ کے بیچ کا طبقہ۔ اسی لیے اسے مڈل کلاس یعنی درمیانہ طبقہ کہا جاتا ہے۔ یہ

بنیادی طبقہ اس لیے نہیں ہوتا کہ اس کی اکثریت حکم ران طبقے کی وہ ضروریات پورا کرتی ہے جن کا تعلق ذہنی سرگرمی اور سروسز سے ہوتا ہے۔

یہ اس لیے بھی غیر بنیادی طبقہ ہوتا ہے کہ اس سے کچھ لوگ پرولتاریہ کے ساتھی اور انقلابی بن جاتے ہیں۔ اس انقلابی دانش ور کو نچلے کلاس کو انقلابی نظریہ سے لیس کرنا، اسے متحد و منظّم کرنا اور اس کی جدوجہد کو سمت دینا ہوتا ہے۔ اس کی توانائی، علم اور مہارت نچلے کلاس کی نجات پہ مبنی معاشرے کے قیام پہ صرف ہونا ہے۔ اسے مروج بورژوا تصورات سے جان چھڑانے کے لیے مزدور طبقے کی تحریک سے جڑا رہنا ہے۔

گو کہ بہت کم، مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خود محنت کش لوگوں کے اندر سے انقلابی دانش ور پیدا ہوں۔ ہر دو صورتوں میں روشن فکر دانش ور لوگوں کو بورژوا سیاست و معیشت کی استحصالی نوعیت سے آگاہ رکھنے کا کام کرتا رہتا ہے اور انھیں سماجی انصاف پہ مبنی سماج کے قیام کی جدوجہد میں شامل رہنے کی جدوجہد کرتا ہے۔ انقلابی دانش ور اپنے ممبروں کو بورژوازی کے پھیلائے ہوئے نظریاتی کنفیوژنوں سے ہمہ وقت برسرِ پیکار رکھتا ہے۔

سائنسی سوشلزم کی بنیاد، اس کے اصولوں اور قوانین کی یعنی مزدور طبقے کی آمریت، آہنی ڈسپلن کی حامل کمیونسٹ پارٹی، اور سوشلسٹ تحریک کو تمام موقع پرست اور ترمیم پرست رجحانات سے پاک کرنے کے لیے نظریاتی جدوجہد عوامی دانش ور کے اہم فرائض ہوتے ہیں۔

ایک اور سازش یہ کی جاتی ہے کہ غیر ضروری طور پر ''تمام لیفٹ کو متحد'' کرنے کے خوش نما نعرے عام کیے جاتے ہیں۔ ہر اُس فرد کو تنظیم میں شامل نہ کیا جائے جو خود کو سوشلسٹ کہتا ہے۔ ہمہ وقت چوکنا رہنا چاہیے کہ تنظیم میں یا معاشرے میں سوشلزم کی نظریاتی جدوجہد کی راہیں ہم وار ہوں۔ سوشلزم دو مخالف سماجی کلاسز کے درمیان جاری کلاس جدوجہد اور اس کلاس جدوجہد میں مزدور کلاس کی نمائندگی کے سیاسی رجحان کا نام ہے۔ مزدور کلاس کی کلاس سٹرگل سے انکار کرنے والے ہر رجحان کی مخالفت کرنی چاہیے۔ کلاس جدوجہد ہو گی تو نظریاتی جدوجہد بھی لازماً ہو گی۔ صرف کپٹلزم کی مخالفت کرنا کافی نہیں۔ ضرورت ہے کہ آپ ورکنگ کلاس کی آمریت کے ذریعے

کپٹلزم کو ختم کرنے پر، اس کے لیے آہنی ڈسپلن کی حامل انقلابی پارٹی پر اور بے لچک، بے خوف نظریاتی جدوجہد پر یقین رکھتے ہوں۔

کلاس سیاست سے وابستہ کارکن اور دانش ور کلاس سیاست کے سٹریٹجکل آپریٹر ہوتے ہیں۔ وہ کلاس تضادات کو تیز کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔

آج کا دانش ور اس لیے کنفیوز اور مایوس ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے ماسوائے اپنی جگہ کے۔ اُسے ہر جگہ تقریر اور مقالہ خوانی کی لت ترک کرنا ہو گی۔ اُس کی یہ دلیل بھونڈی ہے کہ ''ہم نے وہاں اپنی بات رکھنی ہے۔'' اُسے ''مجمعے بازی'' چھوڑنی ہو گی۔ انقلابی دانش ور اور سیاسی ورکر کو اپنے کلاس میں، اپنے حلقے میں ہی رہنا ہو گا۔ اُسے اپنی معین جگہ چھوڑنے کا کوئی حق نہیں۔ نہ اخلاقی اور نہ سیاسی۔

محکوم طبقہ اور قوموں کی پارٹی ورکنگ کلاس کی چیمپین ہے۔ ہر ملک کی ورکنگ کلاس مشکل ترین ورکنگ کلاس ہے۔ ملک کی ورکنگ کلاس کثیر نسلی ہوتی ہے۔ چناں چہ آج مغربی ممالک کے مزدور طبقے میں افریکن ہیں، لاطینی نژاد ہیں، ایشین ہیں اور گورے ہیں۔ سماجی طور پر دھتکارے ہوئے دیگر لوگوں مثلاً خواتین، نسلی اور مذہبی اقلیتی گروہوں کے لوگ یک جہتی کے لیے اِسی پارٹی کی طرف دیکھتے ہیں۔ اتنی وسیع جمہوری الائنس والی دوسری پارٹی نہ ہو گی۔ بڑا فریضہ ہے آرگنائز ڈ لیبر، نسلی و قومی محکوموں اور عورتوں کے اتحاد کو برقرار رکھنا۔

ایک اور فکری کجروی بھی پھیلائی جاتی ہے۔ مظلوموں کی پارٹی بہت مقامی ہوتے ہوئے بھی مقامی، ملکی یا قومی نہیں ہوتی ہے۔ اس پارٹی کی ایک اہم ڈیوٹی ہے: انٹرنیشنل ورکنگ کلاس کی یک جہتی۔

پارٹی کو اپنے گرد ماس فرنٹس کو یکجا کر کے جلسوں جلوسوں، تقریروں تحریروں اور الیکشنوں کے ذریعے آگے بڑھتے رہنا ہے۔

ایک اور بڑا فیصلہ یہ کہ مزدور طبقے کی پارٹی ماضی کے تجربات سے سیکھے گی تو سہی مگر وہ ماضی کے کسی ماڈل سے جڑی نہیں ہو گی۔ وہ خود اپنے حالات کے مطابق اپنا ماڈل وضع کرے گی۔

پارٹی کا وژن ہونا چاہیے کہ ایسا معاشرہ ممکن ہے جہاں جیلیں نہ ہوں گی ۔ جہاں دیواریں اور سرحدیں انسانوں کو الگ نہیں کریں گی بل کہ یہ انسانوں کے دلوں روحوں کو ملانے والی پُل بنیں گی ۔ اسلحہ ہل کے پھل بن جائیں گے اور کپٹلسٹ لوگ وہیں جائیں گے جہاں بادشاہ اورڈائنوسار چلے گئے ۔

ماضی اور حال کے سارے اسباق کو سامنے رکھ کر اپنا راستہ بنانا ہوگا۔ مزدور طبقے کی طرف سے سیاسی اقتدار کے حصول کا کوئی ٹیسٹ پیپر اور گٹ تھروگائیڈ موجود نہیں ہے۔ کوئی مینوئل موجود نہیں ہے۔ اسی طرح اُس مستقبل کے نظام کے خاص فیچرز کے لیے بھی کوئی ماڈل موجود نہیں ہے۔ پہلا قدم کب اٹھایا جائے ، آئندہ کی رفتار کیا ہو، سماج کو ساتھ کس طرح ملایا جائے ، اِن سب کے لیے ریاضی جیسے کلیے اور فارمولے موجود نہیں ہیں ۔

ہر مظہر کی داخلی ساخت ہی ایسی ہوتی ہے کہ اُس کے اندر تبدیلی نامی خوشبو نے پھیلنا ہے۔ اگر اس کا ایک راستہ بند کر دیا جائے تو یہ دوسرے راستے سے پھوٹ پڑتا ہے ۔ اگر اس کے سارے روایتی راستے بند کر دیے جائیں تو یہ غیر روایتی راستوں سے کھل اٹھتی ہے اور کبھی کبھی تو ایسے راستوں اور طریقوں سے کہ خود اس تبدیلی کے لیے کام کرنے والے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ اس لیے حالات پختہ ہو جانے پہ کوئی نہیں جانتا کہ کون سی چنگاری کس جگہ سے اور کب ، شعلے بھڑکا دے گی ۔

اپنی اپنی تاریخ ، روایات اور اپنے عوام کی حالت پر مبنی اپنی راہ تلاش کرنا ہوگی ۔

بہت ہنرکاری سے ''آج'' کے کپٹلزم کی بیماری کے علاج کے نسخے کا استعمال ''آج'' کے حالات کے مطابق کرنا ہوگا۔

بلوچستان کے عوام آج بھی پانچ طرح کے جبر سے نجات کی جدوجہد کر رہے ہیں:

1۔ سرداری جاگیرداری نظام کی باقیات کے خلاف

2۔ ابھرتے اور مؤثر ہوتے ہوئے کپٹلزم کے خلاف

3۔ سام راج کے خلاف

4۔ بلوچستان پہ مسلط قومی جبر کے خلاف

5۔ صنفی جبر کے خلاف

اس سب کے متبادل کے بہ طور ہمارے عوام ماہی گیروں ، چرواہوں ، سار بانوں ، کسانوں اور مزدوروں کی اکثریت پر مشتمل جمہوری ریاست چاہتے ہیں۔ جہاں مرد و زن مل کر ایسی حکومت بنائیں جو داخلی جبر و استحصال سے پاک ہو اور خارجی طور پر کسی دوسری قوم کے جبر سے آزاد ہو۔ ایسا سماج جہاں نہ عقیدے کے نام پہ ظلم ہو، نہ نسل و زبان کی بنیاد پر اور نہ مرد عورت کے امتیاز پر۔ مظلوم طبقات اپنی پارٹی کے پرچم تلے اپنے اتحادیوں کو ساتھ لے کر مخالف قوتوں اور اُن کے اتحادیوں کے خلاف شدید جدوجہد کے بعد ہی فتح مند ہو پائیں گے۔

عوامی بالادستی کی جدوجہد تب ہی کام یاب ہوگی جب دانش ور بورژوا سیاسی شعبدہ سے راستے جدا کریں گے ۔ سارے تو نہیں مگر کم از کم دانش وروں کے ایک حصے کو تو عوامی نظریے پر مبنی ایک متبادل سیاسی پارٹی بنانا ہوگی ۔ ایسی پارٹی جو ''حکم ران طبقات'' سے تعلق نہ رکھتی ہو، بل کہ عوام سے ہو۔ جو محض لیڈروں سے نہ چلتی ہو بل کہ پارٹی کے اندر اداروں اور عوامی آزادی کے نظریہ سے مزین و مستحکم ہو۔ ایسی پارٹی جو ہر اُس پہاڑ سے ٹکرا جائے جو عوامی بالادستی کے سامنے رکاوٹ بنے ۔

کپٹلزم کا متبادل نظام

انیسویں صدی میں جا کر فلاسفرز، بالخصوص کارل مارکس اور اینگلز اس قابل ہوئے کہ تمام یوٹوپیائی فلاسفروں کی دریافتوں کو اکٹھا کریں اور سماج کے مجموعی مطالعے پہ لگ جائیں۔ چناں چہ نظریات کا جو مجموعہ یوٹوپیائی مفکروں کی دریافتوں کو اکٹھا کرنے، ان کی نوک پلک سنوارنے اور انھیں سائنسی صورت دینے سے وجود میں آیا، اُسے مارکسزم کہتے ہیں۔ اس مارکسزم میں سپارٹیکس سے لے کر انیسویں صدی تک کے یوٹوپیائی فلاسفروں کی تعلیمات سموئی ہوئی ہیں۔

مارکسزم نے کچھ عجب دریافتیں کیں۔ ایک یہ کہ کپٹلزم میں محنت کا استحصال ہوتا ہے، چناں چہ سرمائے کا ارتکاز ہوتا ہے۔ یہ بھی کہ کپٹلزم سماجی ترقی کا حتمی نہیں بل کہ ایک عبوری پڑاؤ ہے۔

پھر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ آزاد مقابلہ ختم ہوا اور مونا پولیز (اجارہ داریاں) قائم ہوئیں۔ یہی وہ مقام ہے جسے امپیریلزم یا سام راج کہا جاتا ہے۔ منڈیوں پر قبضہ شروع ہوا تھا اور مقبوضہ منڈیوں کا درندگی کے ساتھ استحصال شروع ہوا تھا۔ منڈیوں کی تقسیم پر چھوٹی مقامی جھڑپوں جنگوں سے لے کر عالمی جنگیں ہوئی تھیں۔ سلسلہ جاری ہے۔

یوں یہ کپٹلزم بلند تر مراحل میں داخل ہو کر اپنا نام، حلیہ اور کرتوت ڈائن کی صورت میں بدل چکا: سام راج یا امپیریلزم۔

اس کا خاتمہ آٹومیٹک نہ ہوگا، اس کے لیے عوام الناس کی شعوری اور انقلابی مداخلت حتمی طور پر ضروری ہے۔

مارکس اور اینگلز نے یہ بھی دریافت کیا کہ استحصال کے بغیر، ایک ''خود حکم راں'' سماج کی طرف جو تبدیلی ہوگی، وہ انقلابی تبدیلی ہوگی، ارتقائی نہیں اور یہ کہ مزدور طبقہ اس انقلاب کی راہ نمائی کرے گا۔

مارکسزم نے اپنی دریافتوں پر اکتفا کرنے کے بجائے ہمیشہ اُن کی آب یاری کرتے رہنے کا اصول بھی دریافت کیا۔ اس نے خود کو جامد، ساکن ڈوگما بنائے رکھنے کو مسترد کر دیا۔ مارکسزم زندہ ہی اُس وقت تک رہے گا جب تک کہ نئے نئے تجربات و مظاہر سے اس کی مسلسل وابستگی رہے گی۔ مارکسزم جدید ترین تضادات، اُن کے شیڈز اور پیچیدگیوں کے ساتھ رشتہ استوار رکھتا ہے۔

مارکسزم تھیوری اور پریکٹس کے بیچ باہم عمل کرتے ہوئے، باہم اثر ڈالتے ہوئے زندہ رہتا اور بڑھوتری کرتا ہے۔ مزدور طبقہ کپٹلزم سے اپنی آزادی کے حصول کے لیے مارکسزم کا ہتھیار استعمال کرتا ہے اور ایسا وہ اپنے اپنے خصوصی حالات کے مطابق کرتا ہے۔

چناں چہ مارکسزم عقیدہ نہیں ہے۔ یہ رواج نہیں ہے، یہ کوئی آئین بھی نہیں ہے۔ یہ ریڈی میڈ گائیڈ والی کتاب بھی نہیں ہے۔ اسے ایک ملک سے کاپی کر کے دوسرے ملک میں پیسٹ نہیں کیا جا سکتا۔ حتیٰ کہ یہ بہ ذاتِ خود ''حقیقت'' بھی نہیں ہے۔ یہ تو ''حقیقت تلاش کرنے کا'' سب سے سائنسی طریقہ ہے۔

جدوجہد کی ان صورتوں کو لے کر چلنے کے لیے پرولتاریہ کو ایک سیاسی پارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ چناں چہ وہ اپنی سیاسی پارٹی بناتے ہیں۔

منافع منڈی کا آخری مقدر یہ ہے کہ انقلابی سیاسی پارٹی کے ٹھیک تجزیہ اور ٹھیک جدوجہد سے بالآخر، بالآخر اُسے ختم کیا جاتا ہے۔ کپٹلزم اپنی انڈسٹری میں، خواہ جتنا بھی ٹکنالوجی استعمال کرے، اُس میں مزدور کی بہر حال ضرورت ہوتی ہے اور یہی مزدور اس پورے آفت نظام کو ڈھا سکتا ہے۔ مزدور ایسا اپنے آپ کی آزادی کے لیے کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ تو انسان تھا مگر اسے

ظلم و نابرابری میں دھکیل کر بھوک، کم اجرت اور افلاس کا جانور بنا دیا گیا۔ وہ ناقابلِ بیاں انداز میں اور ناقابلِ بیان حد تک دوبارہ اشرف المخلوق بننے کی آزادی کی خواہش رکھتا ہے اور دوبارہ اشرف المخلوقات بننے کے لیے تن من سے لڑتا ہے۔ مرجاتا ہے، ناکام ہوتا ہے، برباد ہوتا ہے، شکست کھاتا ہے۔ فتح پاتا ہے، مگر لڑنا ترک نہیں کرتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ کیپٹلزم خواہ ہر کلومیٹر پہ کارخانے لگائے تب بھی اس نظام میں رہتے ہوئے بے روزگاری ختم نہیں ہوسکتی۔ وہ ہر سال بے روزگاری میں اضافہ ہی کرتا رہے گا۔ وہ روبوٹ استعمال کرے گا، دوسری ٹکنالوجی ایسی لائے گا جہاں اسے مزدوری سستی پڑتی ہو۔ اس لیے کہ منافع ہی تو پورے کیپٹلزم کی محرک قوت ہوتی ہے۔

ترقی یافتہ کیپٹلزم میں ایک اور معاملہ یہ ہوتا ہے کہ پیداوار کا کردار تو سماجی ہوتا ہے جب کہ ملکیت پرائیویٹ ہوتی ہے۔ یہ تضاد ترقی کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔

یہ سارے تضادات بحران بن جاتے ہیں اور ہر چار پانچ سال بعد لوٹ کر آتے ہیں۔ اور بورژوازی اور پرولتاریہ کے بیچ جنگ شدید تر ہوتی جاتی ہے۔

عالمی سطح پر یا علاقائی اور مقامی سطح پر مارکسزم کے سوا کوئی ایسی فکری تحریک نہیں ہے جس نے نسلِ انسان کی وحدت، نسلِ انساں کی ترقی اور خوش حالی کے لیے امن، جمہوریت، برابری اور بنیادی انسانی حقوق و سماجی انصاف کا پرچم بلند کیا ہو یا بامقصد پرمسرت زندگی کی حسین منزل کا راستہ دکھا رہی ہو۔

مارکسزم کی فکری تحریک احترم آدمیت کی تحریک ہے، انسان کی سربلندی کی تحریک ہے۔ عالمی برابری کی تحریک ہے۔ تسخیر کائنات کی تحریک ہے۔ ایک خوب صورت، حسین اور غیر استحصالی سماج کی تعمیر کی تحریک ہے۔

سوشلزم میں مشین ایک آدمی کی نہیں سرکار کی ہوتی ہے اور سرکار محنت کش کی ہوتی ہے۔ اس لیے مزدور کو محض تین گھنٹے نہیں بل کہ زیادہ گھنٹوں کی اجرت ملتی ہے۔ حقیقی گھنٹوں کی حقیقی اجرت کے آس پاس۔

فتح تک لڑائی محنت کش طبقے کی مجبوری ہوتی ہے۔ ہم نے اُسے ایسا کرتے دیکھا ہے: روس میں، چین میں، ویت نام میں، کیوبا میں۔ جہاں اس نے سرمایہ دارانہ نجی ملکیت کا ''ماتمی ڈھول'' پٹوایا تھا اور سماج کی ازِسرنو تنظیم کاری کی تھی اور ایسا کرتے ہوئے مزدور اِس منافع مارکیٹ کے گلوبل مظہر کے سامنے گلوبل حل ہی پیش کرتا ہے:

دنیا بھر کے مزدورو، اور محکوم قومو! ایک ہوجاؤ!!